مختصر تاریخ
مدرسہ امینیہ اسلامیہ
شہر دلّی

ناشر

مدرسہ امینیہ اسلامیہ
کشمیری دروازہ، دلّی

مولانا حفیظ الرحمان صاحب واصفؔ حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ صاحبؒ کی یادگار ہیں۔ موصوف نے علم و تحقیق کی پوری توانائی سے کام لے کر مندرجہ ذیل قیمتی معلوماتی اور تاریخی مضمون تحریر کیا ہے۔ اس مضمون کی ابتدا اور ارتقاء دونوں شاہجہاں آباد دہلی کی علمی عظمت پر شاہد عادل ہیں۔ ولی اللہی خاندان کے تذکرہ کے بغیر دینی تعلیم کا کوئی تذکرہ مکمل نہیں ہو سکتا۔

اس خاندان کی مرکزی شخصیتیں دِلّی جیسے مرکزی شہر سے ابھریں اور علم و فکر اور دین و دانش کی دُنیا پر چھا گئیں۔ واصفؔ صاحب نے مضمون مدرسۂ امینیہ پر لکھا ہے۔ مگر دہلی مرحوم کا پورا تذکرہ اس میں آ گیا ہے۔ جس نے مضمون کی قدر و قیمت کو بلند سے بلند تر کر دیا ہے۔

(از مدیر ماہنامہ البلاغ بمبئی)

برِّ صغیر کی ایک کامیاب دینی درسگاہ

بلغوا عنی ولو آیۃ

اسلام کی اساس ایک ایسے عمل کے اوپر ہے جو دنیا میں تمام کاموں سے زیادہ کٹھن اور مرد آزما ہے۔ اور وہ ہے دعوت و تبلیغ (یعنی خدا کی مخلوق کو سچائی کی طرف بلانا اور خدا کا پیغام پہنچانا) اس کام کی خاطر اللہ رب العزۃ کے بھیجے ہوئے پیغمبروں نے اللہ کی نافرمان مخلوق کے پتھر کھائے اور طرح طرح کی اذیتیں برداشت کیں۔ یہ پیغمبروں ہی کی ہمت و جرأت تھی کہ انھوں نے ایسا کٹھن کام کیا، جو بحیثیت انسان ہونے کے انسانی طاقت سے باہر تھا۔

انبیائے پیشین کے زمانوں میں اس کام کی ذمہ داری صرف انبیاءؑ پر تھی۔ لیکن پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سلسلۂ نبوت کے ختم ہو جانے کی وجہ سے یہ اہم ذمہ داری آپ کی امت کو سونپ دی گئی۔ اور اس امتیازی عہدے کی وجہ سے اس کو خیر الامم کا خطاب عطا فرمایا گیا۔ اور امت کے علمائے راسخین و ائمہ مجتہدین کو انبیائے پیشین کی ذمہ داری کا شرف عطا فرما کر علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل کا طغرائے امتیاز بخشا گیا۔ اور یہ سچ ہے کہ علمائے امت نے انبیاء کی جانشینی کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ بڑی بڑی سختیاں جھیلیں، تکلیفیں اٹھائیں، مگر دین کی خدمت سے منھ نہ موڑا۔ دشمنوں کے پتھر کھائے، اپنوں

کے طعنے سُنے، مگر اپنی دُھن کو نہ چھوڑا۔ بھوک، پیاس اور تنگیٔ معاش کی پروا نہ کی اور دین کی اشاعت اور کتاب و سنت کی تعلیم میں لگے رہے ۔

تبلیغ دین کے تمام شعبوں کی اساس روایت پر ہے ۔ اس باب میں علمائے اسلام نے بہت محنت اور جاں فشانی کی ہے ۔ اسلام میں سلسلۂ روایت جتنا مکمل اور مضبوط ہے اس کی نظیر نہیں مِل سکتی ۔ یہ سلسلۂ روایت ہی تو ہے جس کے ذریعہ سے احکام شرعیہ نکھرتے ہوئے ہم تک پہنچے ہیں ۔ یوں تو کتابوں کا مطالعہ کر کے ذہین آدمی بڑی قابلیت پیدا کر سکتا ہے مگر حق یہ ہے کہ اس سلسلۂ روایت کے ساتھ منسلک ہونے میں بڑی برکت و سعادت ہے، اور وہ حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ استاد اور شیخ کے آگے زانوئے تلمذ تہ نہ کرے ۔ استاد اور شیخ ہی اس سلسلۃ الذہب کی وہ کڑی ہے، جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے شاگردی کا رشتہ جوڑ دیتی ہے ۔

دہلی کی مرکزیت

دین کی تعلیم و روایت کے لئے علمائے امت نے ہر دور میں بڑی بڑی عظیم الشان درسگاہیں قائم کیں، مگر حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی درسگاہ کو جو مرکزیت حاصل ہوئی وہ کسی کو حاصل نہیں ہوئی ۔ غیر منقسم ہندوستان میں جتنی درسگاہیں موجود ہیں ان کا سلسلۂ روایت حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ تک اور ان کے ذریعہ سے مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام تک پہنچتا ہے ۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی درسگاہ پرانی دہلی میں کوچہ شیخ زردر کے اندر واقع تھی ۔ اس کا نام مدرسۂ رحیمیہ تھا ۔ یہ مدرسہ آپ کے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۱۳۱ھ) نے قائم کیا تھا ۔ اب اس مقام پر مہندیوں کا قبرستان واقع ہے اور اسی جگہ آپ کا خاندانی مقبرہ ہے ۔

مدرسۂ رحیمیہ میں حضرت شاہ صاحب (المتوفی ۱۱۷۶ھ) بارہ سال یعنی ۱۱۴۳ھ تک تعلیم و تدریس میں مشغول رہ کر حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے

اور حرمین شریفین کے مشاہیر محدثین و مشائخ سے فیض حاصل کیا، ۱۱۴۵ھ میں آپ سفرِ حجاز سے واپس تشریف لائے تو طلبہ کی بہت کثرت اور ہجوم ہوا۔ مدرسے میں جگہ کی قلت اور تنگی کی وجہ سے مغل بادشاہ محمد شاہ (المتوفی ۱۱۶۱ھ) نے آپ کو شاہ جہاں آباد کے ایک محلہ (کوچہ فولاد خاں عقب کلاں محل) میں ایک وسیع مکان عطا فرمایا جو مدرسہ شاہ عبدالعزیزؒ کے نام سے مشہور ہے۔ آپ اور آپ کے بعد آپ کے صاحبزادے حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ) اسی جگہ درس تدریس میں مشغول رہے۔ اس جگہ اب محلہ آباد ہے۔ اس کے آثار میں سے صرف ایک گنبد کی ڈاٹ اور صدر دروازہ کی چوکیاں باقی رہ گئی ہیں۔ اور یہ بقیہ آثار بھی عمارتوں کے اندر دب کر غیر محسوس سے ہو گئے ہیں۔ چند واقف کار لوگ اسکی نشاندہی کر سکتے ہیں۔

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے دور میں اس درسگاہ کو زبردست مرکزیت حاصل تھی۔ آپ کے انتقال کے بعد آپ کے نواسے حضرت شاہ محمد اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۶۲ھ) نے مدرسہ شاہ عبدالعزیز کی نگرانی بھی فرمائی اور درس بھی دیتے رہے آخر میں آپ نے اپنے مکان (واقع بازار امیر خاں مقابل محلہ سوزنگراں) میں مشغلۂ درس جاری رکھا۔ اور ۱۲۵۶ھ میں اپنے چھوٹے بھائی، مولانا شاہ محمد یعقوب اور تمام اہل و عیال کے ساتھ مکہ معظمہ کو ہجرت فرمائی۔ آپ کی حویلی مدرسہ شاہ محمد اسحٰق کے نام سے مشہور ہے۔ اور اب اس میں محلہ آباد ہے۔ اندر کچھ آثار موجود ہیں اور باہر ایک چھوٹی سی مسجد آپ کے نام سے مشہور ہے۔

دلی کا سنبھالا تیرھویں صدی ہجری کا یہ وسطی زمانہ علم و ہنر اور ادب و فضل کے لحاظ سے بڑا معمور زمانہ تھا۔ شاہ جہاں آباد علماء و فضلاء اور اہلِ کمال کا مرجع و مرکز بنا ہوا تھا۔ کئی دارالعلوم تھے، آب و تاب سے چل

رہے تھے، گھر گھر علوم و فنون اور تعلیم و تعلم کا چرچا تھا۔ حضرت شاہ عبدالعزیز، حضرت شاہ عبدالقادر، حضرت شاہ رفیع الدین رضوان اللہ علیہم کے تلامذہ اور خاندان ولی اللّٰہی کے فیضیافتہ علماء و ادباء، اور شعراء و حکماء علوم و فنون کی خدمت میں منہمک تھے۔

مدرسہ دارالبقا اور مدارسۂ دہلی میں تعلیم و تدریس اور دیگر مساجد و مکاتب میں وعظ و تذکیر اور علمی تذکرے رہتے تھے۔

مدرسۂ دارالبقا کی بنیاد ۱۰۶۰ھ میں جامع مسجد شاہجہانی کے ساتھ رکھی گئی تھی۔ یہ مدرسہ جامع مسجد کے جنوب مغربی سموسے پر واقع تھا۔ مرورِ زمانہ اور آفات و حوادث کی وجہ سے تیرھویں صدی کے اوائل میں برباد ہو چکا تھا۔ حضرت مولانا مفتی صدرالدین آزردہ (المتوفی ۱۲۸۵ھ) نے زرِ خطیر صرف کر کے اس کی مرمت کرائی۔ جو حجرے شاہی زمانے کے باقی تھے ان کی درستی کرائی، اور بعض حجرے از سرِ نو بنوائے، درسگاہیں وغیرہ بنوائیں۔ اور مدرسے کو از سرِ نو جاری کیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں یہ مدرسہ ختم ہو گیا۔ عمارتیں گرا کر صاف میدان کر دیئے گئے۔
۱۲۷۳ھ

مدرسۂ دہلی یا دہلی کالج، علوم مشرقیہ کا ایک دارالعلوم تھا، جو حکومت انگلشیہ نے ۱۸۲۵ء / ۱۲۴۱ھ میں مدرسۂ غازی الدین (بیرون اجمیری دروازہ) کی شاہی عمارت میں جاری کیا تھا۔ اس کے صدر مدرس حضرت شاہ عبدالعزیز رح کے خاص شاگرد مولانا رشید الدین خاں دہلوی مقرر کیے گئے تھے۔ (یہ مولانا رشید الدین خاں وہی ہیں جو مصنف نفحۃ الیمن کے خاص دوست تھے، دونوں میں خط و کتابت رہتی تھی، ان کے عربی خطوط مکاتیب رشیدیہ کے نام سے مطبوعہ ہیں) سر سیّد احمد خاں، منشی ذکاء اللہ، مولوی ضیاء الدین، مولوی ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ اسی کالج کے فیض یافتہ تھے۔ مولانا رشید الدین خاں کی وفات کے بعد ان کے عزیز شاگرد

مولانا مملوک العلی نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۶۷ھ) صدر مدرس ہوئے۔ آپ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے استاد اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ (اوّلین صدر مدرس دارالعلوم دیوبند) کے والد ماجد تھے۔ آپ کے انتقال کے بعد آپ کے شاگرد مولوی سید محمد صاحب اس دارالعلوم کے صدر مدرس ہوئے۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد جب کالج دوبارہ جاری ہوا، تو اس میں شعبۂ علوم مشرقی نہیں تھا۔ اور اس کا نام دہلی کالج کے بجائے اینگلو عربک کالج تھا ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد کالج کے ارباب حل وعقد نے ذہنی مرعوبیت یا اور کسی مصلحت کی بنا پر اس کا نام بدل کر پھر پرانا نام دہلی کالج رکھ دیا ہے۔

اس عہد مرحوم کے علمی عروج کا کیا کہنا! حضرت مفتی صدرالدین خاں آزردہ (صدرالصدور) مولانا رشید الدین خاں (صدر مدرس مدرسہ علوم مشرقیہ) مولانا نواب قطب الدین خاں مصنف مظاہر حق، مولانا سید نذیر حسین محدثؒ، مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ۔ مولانا فضل حق خیرآبادی، مرزا غالب، فصیح الملک داغ دہلوی، شیخ محمد ابراہیم ذوق، حکیم مومن خاں مومن، علاوہ ازیں سینکڑوں علماء و فضلاء جمع تھے۔ اور علم وادب کی خدمت میں سرگرم تھے۔

مگر شاہجہاں آباد کی سیاسی مرکزیت جو کچھ باقی رہ گئی تھی، وہ بھی آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی۔ روز بروز شیرازہ بکھرتا جا رہا تھا۔ سیاسی زوال کے ساتھ دینی مرکزیت بھی کمزور ہو رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ کسی دور میں علوم و فنون کا کتنا ہی چرچا اور اہل کمال کا کتنا ہی ازدحام و اجتماع کیوں نہ ہو، قومی و ملی تعمیر بغیر سیاسی قوت کے ممکن نہیں ہے۔ وہ زمانہ آ چکا تھا کہ اہلِ علم گوشہ نشین ہونے یا ہجرت کرنے پر مجبور ہو رہے تھے۔

یکایک ۱۸۵۷ء کی قیامت رونما ہوئی۔ اور اس نے سیاسی قوت کے

ساتھ ساتھ اسلامی شعائر اور تہذیب و معاشرہ کو تہ و بالا کر دیا اور اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ایک طویل خونین داستان ہے۔ آخری مغل بادشاہ ظل سبحانی ابوظفر محمد سراج الدین بہادر شاہ انار اللہ برہانہٗ کو گرفتار کر کے رنگون (برما) میں لیجا کر قید کر دیا گیا، اور وہیں چھ سال قید میں رہ کر وہ ۱۲۷۹ھ میں جنت کو سدھارے اور رنگون ہی میں دفن ہوئے۔

دینی مرکز کی تبدیلی

ہر انقلاب اپنے ساتھ ہزاروں تباہیاں لاتا ہے اور چھوڑ جاتا ہے۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ تعلیم گاہیں ختم ہوئیں، مسجدیں مسمار ہوئیں، خانقاہیں لٹیں، آبادیاں ویران ہوئیں، اور دہلی کی مرکزیت ختم ہو گئی۔

بارگاہِ نبوت کی وہ امانت یعنی کتاب و سنت کا سلسلۂ روایت جو علمائے راسخین کے سینوں میں پوشیدہ تھی، دہلی سے منتقل ہو گئی۔ اس کو آفاتِ سماوی اور حوادثِ ارضی سے بچا کر اور اپنے سینوں میں چھپا کر لے جانے والے کون تھے؟ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی (قدس اللہ اسرارہم) وغیرہ۔

یہ امانت حضرت شاہ محمد اسحاقؒ کے ہجرت فرمانے کے بعد حضرت شاہ عبدالغنی مجددی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۹۵ھ) کی طرف منتقل ہوئی۔ حضرت شاہ عبدالغنی مجددی فاروقی نے ۱۸۵۷ء؁ ۱۲۷۴ھ کے ہنگامے کی وجہ سے حجاز مقدس کی طرف ہجرت فرمائی اور ان سے حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی نے تعلیم حاصل کی، اس طرح یہ امانت دہلی سے دیوبند، سہارنپور اور گنگوہ کی طرف منتقل ہو گئی اور اسلامی علوم کا سب سے بڑا مرکز دارالعلوم دیوبند قرار پایا۔

شاہجہان آباد طویل عرصے تک اخلاقی گراوٹ اور بدعات کا گہوارہ بنا رہا۔

اچھے لوگ یا تو رخصت ہی ہو گئے تھے یا اپنے گھروں میں عزت سنبھالے بیٹھے تھے۔ مشہور مقولہ ہے کہ "دہلی کبھی اہل کمال سے خالی نہیں رہی"

تاریخی حیثیت سے یہ مقولہ ہمیشہ درست رہا ہے۔ امن ہونے اور عام معافی کا اعلان ہونے کے بعد دہلی میں بہت سے علماء و فضلاء پھر جمع ہونے لگے۔ اور رفتہ رفتہ علوم و فنون کا چرچا ہونے لگا۔ اسکول و کالج جاری ہونے شروع ہوئے نئی نئی عمارتیں بننی شروع ہوئیں مگر حقیقت نگر آنکھیں کسی اور چیز کو تلاش کر رہی تھیں یعنی شاہ عبدالعزیز رح کی دہلی۔

مدرسۂ امینیہ دہلی

یکایک دریائے رحمت جوش میں آیا اور تقریباً چالیس برس کے بعد پھر وہ وقت آیا کہ دہلی کی گم شدہ متاع پھر دہلی کو مل جائے۔ اور کھوئی ہوئی دولت واپس آجائے۔

۱۳۱۵ھ میں مولانا نانوتوی رح کے شاگرد رشید حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ سے چند ساتھی علوم نبویہ کی امانت اپنے سینوں میں لے کر چلے۔ ان کی آنکھوں میں انوارِ نبوت جھلک رہے تھے۔ اور پیشانیوں سے تامرون بالمعروف وتنہون عن المنکر کے جلیل القدر منصب کی عظمت ٹپک رہی تھی ان چند ساتھیوں سے ہماری مراد ہے حضرت رأس المحدثین مولانا محمد انور شاہ کشمیری، حضرت مفتیٔ اعظم مولانا محمد کفایت اللہ، حضرت مولانا محمد امین الدین اور حضرت مولانا حافظ محمد ضیاء الحق دیوبندی وغیرہ (نور اللہ مرقدہم) یہ سب ہم سبق اور ہم جماعت تھے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر حضرت شاہ صاحب بجنور تشریف لے گئے۔ اور حضرت مفتیٔ اعظم شاہجہانپور تشریف لے گئے۔ اور مولانا امین الدین دہلی تشریف لائے اور آتے ہی ایک دینی درسگاہ کی بنیاد ڈالی یہ دینی درسگاہ جو اس وقت دنیائے اسلام کے مشہور دینی مراکز میں سے ایک ہے مدرسۂ امینیہ کے نام سے معروف و

معلوم ہے۔ یعنی دار العلوم دیوبند، دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مدرسہ امینیہ، مظاہر علوم سہارنپور، مدرسہ شاہی مراد آباد، یہ چند ہی مشہور دار العلوم ہیں، جہاں سے خالص علوم نبویہ کے چشمے اُبل رہے ہیں۔

اس عظیم المرتبت اور جلیل القدر درسگاہ کی بنیاد کس طرح رکھی گئی؟ شاید آپکو خیال ہوگا کہ پہلے ملک کے مشہور لیڈروں اور شہر کے ممتاز دولتمندوں کی کانفرنس بلائی گئی ہوگی اور کئی دن کی بحث و تمحیص کے بعد وسیع پیمانے پر ایک دار العلوم قائم کرنیکا منصوبہ بنایا گیا ہوگا، اور بہت بڑی رقم منظور کی گئی ہوگی۔ طریقۂ کار سوچے گئے ہونگے دس بارہ عدد مالی و انتظامی سب کمیٹیاں بنائی گئی ہونگی۔ اس کے بعد ماہر انجینیروں کی کانفرنس منعقد ہوئی ہوگی، زمین تجویز کی گئی ہوگی، ہواؤں کے رُخ معلوم کیے گئے ہوں گے۔ نقشے منظور کیے گئے ہونگے۔ پھر داغ بیل ڈالی گئی ہوگی — اور سنگِ بنیاد رکھنے کے لئے کسی مشہور لیڈر یا وزیر یا گورنر کا نام تجویز کیا گیا ہوگا، تاریخ اور جلسۂ عام کا اعلان کیا گیا ہوگا۔ جلی عنوانات کے ساتھ کارروائیاں شائع کی گئی ہونگی العظمۃ للہ۔

نہیں ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ان اللہ کے بندوں نے اللہ کی مخلوق میں سے کسی کو مدد کے لئے نہیں پکارا۔ پھر کیا ہوا؟ راقم الحروف نے جو کچھ اپنے بزرگوں سے سُنا وہ آپ بھی سنیئے۔

اپنے ساتھیوں میں سے سب سے پہلے مولانا امین الدین دہلی آئے۔ اور مسجد چھتہ شاہ جی (چاوڑی بازار) میں قیام فرمایا۔ کچھ دنوں کے بعد حضرت مفتیٔ اعظم دیوبند سے دہلی آگئے اور مولانا موصوف کے پاس قیام فرمایا۔ مولانا نے فرمایا کہ اے بھائی مولوی کفایت اللہ! میں ایک مدرسہ قائم کرنا چاہتا ہوں، تم اس معاملہ میں میرا ہاتھ بٹاؤ، حضرت مفتیٔ اعظم نے فرمایا کہ تمہارا خیال مبارک

مسعود ہے۔ میں دل سے تمہارے ساتھ ہوں۔ مگر سردست میرا شاہجہاں پور جانا ضروری ہے۔ کیونکہ میرے شفیق استاد مولانا عبید الحق خاں جنھوں نے کوشش کر کے مجھے حصول تعلیم کے لئے بھیجا تھا۔ مجھے بلا رہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ مدرسہ عین العلم کو تمہاری ضرورت ہے، جلدی آؤ۔ استاد کا حکم ماننا ضروری ہے۔ میں وہاں جاکر حالات کا جائزہ لوں گا اگر موقع ہوا تو آجاؤنگا۔ فی الحال میری رائے یہ ہے کہ تم مولوی محمد انور کو بلالو۔ وہ بھی انشاء اللہ تمہارے ساتھ پورا تعاون کریں گے۔ چنانچہ مولانا موصوف بجنور تشریف لے گئے۔ مولانا محمد انور شاہ مولوی مشیت اللہ بجنوری کے مکان پر قیام پذیر تھے۔ مولانا نے شاہ صاحب سے اپنا مقصد بیان کیا، اور دہلی چلنے پر آمادہ کرلیا۔ مولانا نے شاہ صاحب سے دریافت فرمایا کہ تمہارے پاس کتنے روپئے ہیں؟ شاہ صاحب کے پاس اس وقت کل سات روپے تھے جو انہوں نے مولانا کو دیدیئے اور انھیں سات روپیوں میں دہلی کے ٹکٹ خریدے گئے۔ اللہ اللہ! عزائم کتنے بلند اور عالی۔ ایک کے پاس صرف سات روپیئے اور ایک کی جیب خالی۔ دہلی آئے اور سنہری مسجد چاندنی چوک میں شاہ صاحب کو بٹھادیا۔ دو تین طالب علم مہیا کر لئے۔ تعلیم و تعلم کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ کچھ دنوں کے بعد مولانا موصوف نے مولانا حافظ ضیاء الحق کو بھی دیوبند سے بلالیا۔ لیجئے افتتاح ہوگیا۔ یہ تھے ہمارے اسلاف جو لائحہ عمل سوچنے سے پہلے اور اسباب و ذرائع کی پرواکیے بغیر عمل اور محنت کرنا جانتے تھے۔ اور یہی اس تربیت گاہ کی روح تھی، جس کی نمایندگی کے لئے یہ لوگ نکلے تھے۔ یہ متوکلین جن کے سینوں میں معارف نبویہ کی امانت پوشیدہ تھی، اور جن کی آنکھیں مشکوٰۃ رسالت سے منور تھیں، چار برس تک مسجد کے بوریوں پر بیٹھ کر بغیر تنخواہ کے پڑھاتے رہے۔ پانچ چھ آنے روز خوراک کے لئے مدرسے

سے لیتے تھے اور بس! تقوای ان کا لباس، اور صبر و رضا ان کا اوڑھنا بچھونا
تھا، اور یہی بچی دُھن والے تھے وہ قدسی نہاد جن کو علماء امتی کانبیاء
بنی اسرائیل کے خطاب سے نوازا گیا ہے۔

مدرسۂ امینیہ کی ابتداء ماہ ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۷ء میں ہوئی، مولانا امین الدین
بانی و مہتمم اور مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ سب سے پہلے صدر مدرس تھے، ۲۲ صفر
۱۳۱۶ھ / ۱۸۹۸ء کو چند معززین شہر کو بلا کر سب سے پہلی میٹنگ منعقد کی گئی۔
کس طرح منعقد کی گئی؟ اس کی کیفیت مولانا امین الدینؒ کے الفاظ ہی میں سنئے

"گزارش ہے کہ مدرسہ امینیہ عربیہ اسلامیہ جدیدہ واقع شہر دہلی
عرصۂ دراز سے جاری ہو چکا ہے۔ جیسے کہ جاری ہوا مثل کشتی دریائے
بے سرو سامانی کی موجوں سے اندیشۂ غرق میں تھا۔ اور ہمیشہ کمترین
درگاہ باری تعالیٰ میں دست بدعا تھا کہ یا مجیب الدعوات کوئی رجال
الغیب ابدال صفت ایسا بھیج کہ اس کشتی قریب الغرق کو تھامے،
واہ رے شانِ ایزدی کہ اتفاقاً حضرت مولانا منفعت علی صاحب
دام مجدہٗ، مدرس مدرسۂ دیو بند کسی کار ضروری کے واسطے تشریف لائے
اور مدرسے کو دیکھ کر لفظ مرحبا زبان پر لائے۔ المختصر اس کا ذکر
چند سوداگروں سے کہ جو با خدا ہیں مولوی صاحب نے بیان فرمایا،
وہ سب صاحب دوسرے روز مدرسے میں تشریف لائے کیا دیکھتے
ہیں کہ کہیں حدیث نبوی کا درس ہوتا ہے، کسی جگہ پر فقہ کہیں اصولِ فقہ
پڑھایا جاتا ہے، کہیں صرف و نحو کا چرچا ہے۔ غرض جمیع علوم کے
درس دیکھ کر حیرت میں ہو گئے۔ اور سب صاحبوں نے یہ مشورہ
کیا کہ اس کشتی کو اس دریائے بے سرو سامانی سے نکالنا چاہیئے،

اور ایک سرپرست مقرر کرنا چاہئے، جو ہمیشہ خبر گیراں رہے چنانچہ
جناب شیخ حاجی محمد اسحاق صاحب سوداگر اور جناب الف خان صاحب
روشنائی والے جو کہ اس جلسے میں موجود تھے مقرر کیے گئے۔ اور ان
ذات بابرکات نے خوشی سے قبول فرمالیا، اور سرگرم اصلاح مدرسہ
ہوئے۔

حقیقت نگر آنکھوں کو جس دولت کی تلاش تھی وہ مبدائے فیاض نے دہلی کو دوبارہ عطا فرمادی۔ اس درسگاہ کی بنیادیں اخلاص و توکل، صبر و رضا پر استوار ہوئی تھیں، اور آج تک اللہ کے فضل و کرم سے اہل اقتدار کی احسان مندی سے پاک ہے۔ ابتدائی دور میں اس کی امداد و اعانت کرنے والوں میں مندرجہ ذیل حضرات کے نام بھی موجود ہیں۔

حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا حکیم محمد مسعود احمد صاحب گنگوہی، مولانا مولوی منفعت علی صاحب مدرس مدرسہ دیوبند، مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب، حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب صدر مدرس دارالعلوم دیوبند، مولانا حافظ احمد صاحب مہتمم مدرسہ دیوبند، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اور تمام مدرسین و طلبائے مدرسہ عالیہ فتحپوری اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب انبیٹھوی رحمہم اللہ تعالیٰ۔ غور فرمائیے کہ ان چندہ دینے والوں کے دل کس قدر غنی تھے۔

مورخہ ۸ ربیع الاول ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء کو حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری اپنی خاندانی ضروریات کی بنا پر کشمیر تشریف لے گئے۔ مہتمم صاحب نے صدر مدرس کی مسند کے لئے حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ کو تجویز فرمایا، آپ اس وقت شاہجہانپور کے مدرسہ عین العلم میں درس دیتے تھے۔ مہتمم صاحب خود

شاہجہانپور تشریف لے گئے۔ آپ کے مکان پر ہی قیام کیا اور دہلی آنے پر آمادہ کرلیا، آپ شوال ۱۳۲۱ھ ۱۹۰۴ء میں دہلی تشریف لائے، اور شیخ الحدیث و مفتی کا عہدہ سنبھالا۔

کچھ عرصے کے بعد سنہری مسجد کے جنوبی قطعۂ زمین پر دو چار کمرے اور حجرے بنائے گئے، جن کا نقشہ حضرت مفتیٔ اعظم نے خود اپنے ہاتھ سے کھینچا تھا۔ مگر قیام مدرسہ کے بعد سے مدرسہ میں طلبہ کی تعداد بڑھتی جارہی تھی۔ اور جگہ کی تنگی ہوتی جارہی تھی۔ چنانچہ ۱۳۳۳ھ ۱۹۱۵ء میں مسجد پانی پتیاں (علاقہ کشمیری گیٹ) کے متولیان نے مسجد اور اس کی اراضی متعلقہ مہتمم صاحب کو دیدی اور اس پر مدرسے کی تعمیر شروع کر دی گئی۔ مورخہ ۱۰ ر شوال ۱۳۳۳ھ کو جو معاہدہ تحریر کیا گیا، اس کی رو سے مہتمم مدرسہ امینیہ کو مسجد پانی پتیاں اور اس کی متعلقہ اراضی کا ہمیشہ کے لئے متولی بنا دیا گیا۔ ۱۳۳۶ھ میں مدرسہ چاندنی چوک سے منتقل ہوکر اپنی عمارت میں آگیا۔

حضرت مفتیٔ اعظم کا اہتمام اور مجلس منتظمہ کی تشکیل

ماہ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ ۱۹۲۰ء میں (جبکہ حضرت مفتیٔ اعظم اپنے شیخ و استاد مولانا محمود الحسن اسیر مالٹا کے استقبال کے لئے ساحل بمبئی پر تشریف لے گئے تھے) مولانا امین الدین بانی و مہتمم مدرسہ کی وفات ہوئی۔ جدید انتظام و اہتمام کا فیصلہ کرنے کے لئے مدرسے کے سرپرست اور دیگر معززین شہر کی درخواست پر حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ مورخہ ۹ ر شوال ۱۳۳۸ھ کو دیوبند سے دہلی تشریف لائے، مدرسہ میں معززین شہر کا جلسہ منعقد کیا گیا، آپ نے مشورہ فرما کر حضرت مفتیٔ اعظم کو مدرسے کے انتظام و اہتمام کی ذمہ داری

بھی سونپ دی۔

مسجد پانی پتیاں جو نواب لطف اللہ خاں صادق پانی پتی نے ۱۱۳۸ھ ۱۷۲۵ء میں بنائی تھی، بہت بوسیدہ ہوگئی تھی اور نشیب میں آگئی تھی۔ حضرت مفتیٔ اعظم نے اس کو از سر نو ۱۳۵۳ھ میں نہایت خوبصورت اور سنگین تعمیر کرایا۔

حاجی محمد الف خاں کی وفات ۱۳۲۲ھ ۱۹۰۴ء میں اور حاجی محمد اسحاق کی وفات ۱۵ ربیع الاول ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۲ اپریل ۱۹۴۱ء میں ہو چکی تھی اور تنہا آپ کے ہی اوپر مدرسے کی پوری ذمہ داری تھی۔ آپ شیخ الحدیث بھی تھے اور مفتیٔ اعظم بھی اور مسجد و مدرسہ کے مہتمم اور متولی بھی تھے، لہٰذا کچھ اپنے ضعف و نقاہت اور کچھ عہد حاضر کے رجحانات کے پیش نظر آپ نے مورخہ ۱۰ ربیع الاول ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۷ مارچ ۱۹۴۳ء کو ایک مجلس منتظمہ بنائی، اور مدرسہ و مسجد کا اہتمام اس کے سپرد کر دیا۔ مجلس کے لئے مندرجہ ذیل ارکان تجویز فرمائے۔

حضرت[۱] مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب (بحیثیت مہتمم) حضرت[۲] شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی، حضرت[۳] مولانا احمد سعید صاحب دہلوی، حاجی[۴] رشید احمد صاحب تاجر اسلحہ، حکیم حاجی[۵] شریف الدین صاحب بقائی، حاجی[۶] مولوی عزیز الرحمٰن صاحب مجتبائی، حاجی[۷] حافظ محمد احسان الٰہی صاحب تاجر جفت۔

مدرسہ امینیہ کی تعلیمی خدمات

حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے تبحر، جامعیت اور عظمت کی وجہ سے آپ کے عہد اہتمام میں مدرسہ کو بے انتہا ترقی ہوئی۔ تمام علوم و فنون کے علاوہ چالیس چالیس طلبہ صرف درس حدیث حاصل کرتے تھے۔ طلبہ کا اخلاقی معیار

اتنا بلند ہوتا تھا کہ نظیر کے طور پر یاد کیے جاتے تھے۔ مدرسین قابل محنتی اور مخلص تھے افتاء کی وجہ سے مدرسے کو دنیائے اسلام میں مرکزیت حاصل ہوگئی۔ اور اس کو تفقہ فی الدین کا سب سے بڑا مرکز و مرجع تسلیم کیا گیا۔ دارالافتائے مدرسۂ امینیہ کے مفتی کو امتِ مسلمہ نے مفتیٔ اعظم کا خطاب دیا اور ہندی مسلمانوں کی سیاسی و قومی رہنمائی کا اولین مرکز بھی مدرسۂ امینیہ قرار پایا یعنی ۱۳۳۸ھ ۱۹۱۹ء میں جب حضرت مفتی اعظم نے جمعیۃ علمائے ہند کی بنیاد ڈالی تو اس کا پہلا دفتر کچھ عرصے مدرسہ ہذا ہی میں رہا۔ یہ حضرت مفتی اعظم کا فہم و تدبر اور نکتہ شناسی تھی کہ جس نے مختلف الخیال علماء کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا تھا۔

ہندوستان (غیر منقسم) کے علاوہ اکثر بیرونی ممالک مثلاً ایران، افغانستان عراق، حجاز، چین، تبت، ملایا، برما، انڈونیشیا، افریقہ وغیرہ سے فتوے بھی آتے تھے۔ اور ان ممالک سے طلبہ بھی علوم اسلامیہ اور حِکَم نبویہ حاصل کرنے کے لئے آتے تھے۔ ہزاروں پیاسے اپنی روحوں کو سیراب کر کے یہاں سے نکلے، یہاں سے نکھرا ہوا خالص دین لے کر گئے۔ اور دُور دراز ملکوں میں جاکر تعلیم و تدریس، تبلیغ و ہدایت میں مشغول ہو گئے۔

مدرسے کے باب میں حضرت مفتی اعظم کی خدمات اتنی عظیم الشان اور مسلسل ہیں کہ مدرسے کے تذکرے اور آپ کے تذکرے میں تفریق نہیں کی جا سکتی۔ مدرسے کے فارغ التحصیل علماء سب آپ کے تلامذہ ہی ہیں، اس لئے ان میں سے چند حضرات کا ذکر ہم حضرت مفتی اعظم کے تلامذہ کے ضمن میں کرینگے

دہلی کی تباہی

تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے، اور دہلی میں تقریباً نوے برس کے بعد پھر دہرائی گئی۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کے اندر جو خونیں انقلاب آیا، وہ اپنی تباہ کاری و طوفان انگیزی کے لحاظ سے

۱۸۵۷ء کے انقلاب سے بہت زیادہ تھا۔ اس میں جو خونریزی و سفاکی اور اسلامی شعائر کی تباہی ہوئی۔ اس نے تاتاری تباہ کاریوں کو بھی شرمندہ کر دیا۔

یوں تو تمام غیر منقسم ہندوستان میں قتل و غارت کا بازار گرم ہو رہا تھا۔ مگر خاص طور سے غیر منقسم صوبہ پنجاب اور صوبہ دہلی میں تو خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ بڑی بڑی عالیشان عمارتیں آگ کی نذر ہو گئیں۔ اور بستیاں کی بستیاں ویران کر دی گئیں۔ جو کچھ ہوا اور ہوتا رہا مورخ کا قلم اس کو ضبط تحریر میں لانے سے ہمیشہ قاصر رہے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے خونیں انقلاب میں جو کچھ ہوتا ہے اس کی تمام جزئیات کو قلمبند نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اس میں کام آنے والے اور جان کھونے والے لوگ ہزاروں حکایتیں اور شہادتیں اپنے ساتھ ہی لے جاتے ہیں۔

دہلی میں ۴/ستمبر ۱۹۴۷ء مطابق ۱۸/شوال ۱۳۶۶ھ سے منظم حملے شروع ہوئے۔ وہ فساد انگیز عناصر جو پنجاب سے قتل و غارتگری کرتے ہوئے آکر دہلی میں جمع ہو گئے تھے۔ انھوں نے مشتعل تحریک کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ہر ایک ہجوم ہزاروں افراد پر مشتمل ہوتا تھا۔ دہلی کے مختلف محلوں اور بستیوں پر حملے کرنے لگا۔ دہلی کے پرامن باشندے جو اس قسم کے ہنگاموں سے ناآشنا تھے، جب ان پر مسلح بلوائیوں کے ہجوم نے حملہ کیا تو اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا کہ گھربار، مال دولت چھوڑ کر جان بچانے کی کوشش کریں۔ اگر کسی موقع پر ہمت سے کام لے کر مقابلہ کی کوشش بھی کی تو بری طرح تباہ کر دیئے گئے۔

مختصر یہ کہ چند روز کے ہنگاموں نے قرول باغ، پہاڑ گنج، سبزی منڈی وغیرہ کے مسلمانوں کو یا شہید کر دیا یا ویران و خانہ بدوش و تباہ، جو عورتیں ہاتھ لگیں ان کی عصمت دری اور اغوا کیا گیا۔ بچوں کو ماؤں کی گود سے چھین کر ذبح

کیا گیا۔ اور اس گنبد نیلی فام کے نیچے زمین کے سخت جگر پر وہ سب کچھ ہوا جو دہلی کی آنکھ نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ دہلی کی طویل و عریض اور وسیع آبادی میں سے صرف وسط شہر کے علاقے میں کچھ مسلم آبادی بچ گئی، جو مہینوں محصوریت کی حالت میں زندگی گذارتی رہی۔ (از علمائے حق)

وہ چند مبارک و مقدس نفوس جن کے سینوں میں ولی اللٰہی امانت مکنون تھی، اُس ذات مطلق کے قہر و غضب کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ ان کے دلوں میں رہ رہ کر یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ کیا یہ امانت شاہ عبدالعزیز اور اسماعیل شہید کی دہلی سے اب پھر منتقل ہونے والی ہے؟ حضرت مفتیٔ اعظم اپنے دولت خانے (واقعہ کوچۂ چیلاں) میں محصور تھے۔ اور حضرت مولانا ضیاء الحق دیوبندی مدرسۂ امینیہ میں چند طلبہ کے ساتھ بند تھے، اور گلی کوچے اور سڑکیں انسانی خون سے سرخ ہو رہی تھیں۔ ۹ ستمبر ۱۹۴۷ء کو جب گاندھی جی دہلی آئے اور امن قائم کرنے کی کوشش شروع کی تو اجتماعی حملوں سے کچھ امن ہونا شروع ہوا۔ حضرت مفتی اعظم نے مولانا ضیاء الحق اور ان کے ساتھی طلباء کو مدرسے سے دوسری جگہ بحفاظت منتقل کرا دیا۔ اور مدرسے کو مقفل کر دیا اس دوران میں مفتی اعظم اپنے چند شاگردوں کے ساتھ سواری میں (حملہ آوروں کی نگاہوں سے بچتے بچاتے) مدرسے میں تشریف لاتے تھے۔ کچھ دیر تشریف رکھتے تھے۔ اور پھر قفل لگا کر واپس تشریف لے جاتے تھے۔

مدرسۂ امینیہ باوجودیکہ غیر مسلم آبادی میں واقع ہے۔ مگر اللہ رب العزۃ کی رحمت سے بالکل محفوظ رہا۔ ان متوکلین اور صبر و رضا کے بندوں نے خون کے سیلابوں، آگ کے شعلوں، تلواروں کی جھنکار اور

گولیوں کی بوچھاڑ میں ولی اللہی امانت کو جس طرح بچایا، یہ انھیں کی ہمت و جرأت تھی۔ الحمدللہ کہ وہ امانت پہلے کی طرح دہلی سے منتقل نہیں ہوئی، کچھ عرصہ مقفل رہنے کے بعد مدرسہ جاری کیا گیا۔ طلبہ آئے نہیں بلکہ مہیا کیے گئے، نئے مدرسین رکھے گئے۔ اور جس طرح بھی ہوا مدرسہ جاری کر دیا گیا۔ اور آج بھی خدا کے فضل سے جاری ہے۔ کتاب و سنت کی تعلیم و تدریس ہو رہی ہے۔ انھیں قدسی نفس بزرگوں کی برکت تھی کہ دہلی میں کچھ مسلمان باقی بھی رہ گئے۔ اگر دہلی ختم ہو جاتی تو ہندوستان میں کہیں بھی شاید کوئی مسلمان نظر نہ آتا۔ اس دورِ ابتلاء میں کس کے پاؤں نہیں اکھڑے، مگر حضرت مفتیٔ اعظم جن کے بوڑھے جسم میں رُوح جوان تھی، ہر پوچھنے والے سے صاف کہہ رہے تھے کہ میں دہلی سے نہیں جاؤں گا، اگر تم جانا چاہتے ہو تو جا سکتے ہو۔

حضرت مفتیٔ اعظم کی وفات اور مدرسے کا انتظامِ جدید

پچاس برس مسلسل حدیث کا درس دینے اور مخلوقِ خدا کو احکامِ شرعیہ بتانے کے بعد مورخہ ۱۳ ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ مطابق ۳۱ دسمبر ۱۹۵۲ء کو حضرت مفتیٔ اعظم نے رحلت فرمائی، آپ کی وفات کے ۱۲ دن بعد مجلس منتظمہ کا جلسہ ہوا تمام ارکان کے اتفاقِ رائے سے حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہٗ نے اہتمام کا عہدہ مولانا احمد سعید صاحب کے سپرد کیا۔ اور صدر مدرس حضرت مولانا ضیاء الحق دیوبندی کو بنایا۔ یکم شعبان ۱۳۷۳ھ کو صدر مدرس مولانا ضیاء الحق دیوبندی بھی رحلت فرما گئے۔ اب اس وقت صدر مدرس اور مفتی کے عہدے پر حضرت مفتیٔ اعظم کے قابل ترین شاگرد حضرت مولانا مفتی محمد عبدالغنی صاحب دام مجدہ فائز ہیں۔ اور اب ۱۹۶۶ء میں

صدر مدرس و صدر مفتی حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب ہیں - اور اہتمام و انتظام کی پوری ذمہ داری راقم الحروف حفیظ الرحمٰن واصف (ابن حضرت مفتیِ اعظم) کے کمزور کاندھوں پر ہے - کمترین اگرچہ اس بارِ امانت کے اٹھانے کی اہلیت نہیں رکھتا، مگر مندرجۂ ذیل اکابر جو اس وقت مجلس منتظمہ کے ارکان ہیں نگرانی و رہنمائی فرماتے ہیں -

حضرت سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحب دہلوی - حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی - حکیم حاجی شریف الدین صاحب بقائی - حاجی حافظ محمد نسیم صاحب - مولوی شعید الرحمٰن صاحب مجتبائی - حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی - ممکن ہے کہ ان نفوس قدسیہ کی نگاہِ التفات سے یہ خاک کیمیا بن جائے - وما ذلک علی اللہ بعزیز -

جیسا کہ گذشتہ سطور میں عرض کیا جا چکا ہے، مدرسے کی بنیاد سعی و عمل اور صبر و توکل پر قائم ہوئی ہے - اس کی وہ شان آج بھی قائم ہے - اس کا کام اہل خیر حضرات کی امداد و اعانت سے چل رہا ہے ؎

دلیلِ کامرانی ٹوٹ جاتا ہے سہارا دل کا — کہ خود اپنا سفینہ اہلِ ایماں توڑ دیتے ہیں

آٹھ مدرس ہیں جو تفسیر حدیث، فقہ وغیرہ کی درس تدریس میں مشغول ہیں - ساٹھ ستر طلبہ اس وقت بھی عربی کی تعلیم پا رہے ہیں - مدرسے کی عمارت جو بازار نمبر گنج کشمیری گیٹ میں واقع ہے - سہ منزلہ اور شاندار ہے، مدرسہ ہذا اپنی شاندار روایات کے لحاظ سے بھی ایک جلیل القدر دینی مرکز ہے، اور اس کی عمارت بھی اپنی عظمت کے لحاظ سے اسلاف کی مقدس یادگار ہے ؞

مدرسہ امینیہ کے اکابر اور علمائے کرام

حضرت مولانا امین الدینؒ بانی و مہتمم مدرسہ امینیہ

آپ تقریباً سنہ ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۰ء) میں اورنگ آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ بعد ازاں ضلع ناسک میں سکونت اختیار کی۔ آپ سنہ ۱۳۰۳ھ (۱۸۸۶ء) میں بغرض تحصیل علم دارالعلوم دیوبند میں آئے۔ سنہ ۱۳۰۷ھ (۱۸۸۹ء) میں مدرسہ اعزازیہ شاہجہانپور میں جاکر داخل ہوئے۔ وہاں مولوی نادر الدین سے معقولات کی کتابیں پڑھیں۔ مولانا نادرالدین فلسفہ و منطق میں مولانا عبدالحق خیرآبادی ابن مولانا فضل حق کے شاگرد خاص تھے۔ اس عرصے میں مولانا موصوف شاہجہانپور میں محلہ حسن زئی کی مسجد میں مقیم رہے۔ پھر دیوبند میں واپس آکر درس نظامیہ کی تکمیل کی۔ سنہ ۱۳۱۲ھ کے اخیر میں فارغ التحصیل ہوکر دہلی آگئے۔ اور مدرسہ امینیہ جاری فرمایا۔ آپ حضرت مفتی اعظمؒ کے ہم سبق ہم جماعت اور گہرے دوست رہے۔ اور دم آخر تک تعلقات کی استواری میں کوئی فرق نہیں آیا۔

آپ کی شادی سید عابد علی دہلوی کی تیسری صاحبزادی محمودی بیگم کے ساتھ سنہ ۱۳۱۸ھ (۱۹۰۰ء) میں ہوئی۔ اور آپ اپنی سسرال حویلی اعظم خاں گلی احمد شاہ میں مقیم ہوئے۔ پھر سنہ ۱۳۲۴ھ (۲۷ جولائی ۱۹۰۶ء) میں آپ نے گلی احمد شاہ کے

قریب ایک مکان خرید کر از سر نو بنوایا اور اس میں منتقل ہو گئے۔

آپ کی اہلیہ محترمہ آپ کے نکاح میں تقریباً ۱۲ سال زندہ رہیں۔ اور مورخہ ۸ر جمادی الاولیٰ ۱۳۳۷ھ (۹ر فروری ۱۹۱۹ء) کو انتقال ہو گیا۔ مرحومہ نہایت نیک، عابدہ زاہدہ، شب زندہ دار، خدمت گذار، سلیقہ شعار بیوی تھیں، ان کی وفات کا صدمہ اہل خاندان کے علاوہ اہل محلہ تک کو ہوا۔ اور خاص کر مولانا موصوف کو شدید صدمہ ہوا، اور ہمیشہ رہا۔ ان کے انتقال کے ۱۷ ماہ بعد مورخہ ۱۹ر رمضان ۱۳۳۸ھ (۶ر جون ۱۹۲۰ء) کو مولانا کی بھی وفات ہو گئی، اس کے بعد مدرسہ کا انتظام و اہتمام حضرت مفتی اعظم کے سپرد کر دیا گیا۔ مولانا مرحوم اور ان کی اہلیہ کے مزار مہندیوں میں حضرت شاہ ولی اللہ کے احاطے کے باہر واقع ہیں۔

آپ شہر دہلی میں ہی نہیں بلکہ دُور دور تک زہد و تقویٰ میں مشہور تھے۔ عملیات میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ اور اس وجہ سے آپکے عقیدتمندوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ دل میں فیض رسانی کا جذبہ رکھتے تھے۔ نرم خو ملنسار با اخلاق تھے۔ مگر دین کے معاملات اور مدرسے کے انتظامات کے سلسلے میں کسی کی رو رعایت نہیں کرتے تھے۔ اپنے اقارب کی امداد و اعانت فرماتے تھے۔ جب کبھی سفر سے واپس آتے تھے، تو تمام قرابت داروں کے لئے تحفے ضرور لاتے تھے۔ سیاسی ہنگاموں اور دنیاوی مشغلوں سے دامن کش رہتے تھے۔ اپنے مکان میں ایک علیحدہ کوٹھری میں ذکر و عبادت میں مشغول رہتے تھے، طلبہ کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتے تھے اور بڑی شفقت و محبت فرماتے تھے۔ آپ پرانی وضع کے بالکل سیدھے سادے مولوی تھے۔ دفتری امور کی مہارت نہیں رکھتے تھے۔ مولوی عبدالغفور صاحب دہلوی مدرس فارسی بطور نائب مہتمم تمام دفتری امور کو انجام دیا کرتے تھے، حضرت مفتی اعظم کی تشریف آوری

کے بعد مدرسہ کا پورا انتظام حضرت مفتی اعظم کے ہاتھوں میں منتقل ہوگیا۔ روددادوں کی ترتیب و تالیف، مضامین کی تصنیف و تسوید، معاہدے معاملات، غرضکہ تمام امور جو مہتمم صاحب کے نام سے ہوتے تھے، ان میں حضرت مفتی اعظم کا فہم و تدبر اور ہاتھ کارفرما تھا۔

آپ کے انتقال کے بعد مکان میں آپ کے صاحبزادے مولوی سعیدالدین رہے۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب میں کراچی منتقل ہوگئے۔ اب مولانا مرحوم کی صاحبزادی میمونہ بیگم (جو راقم الحروف کی خوشدامن ہیں) اس مکان میں رہتی ہیں۔ مولوی سعیدالدین کے دو ثلث حصے کا سی ہونے کی وجہ سے مکان نیلام ہوچکا ہے۔

مولانا موصوف کی چھ اولادوں میں سے اب یہی ایک صاحبزادی میمونہ بیگم ہی حیات ہیں، بڑے صاحبزادے (مولوی سعیدالدین) کراچی میں جاکر وفات پاگئے۔ ان کی کئی اولادیں پاکستان میں موجود ہیں۔ اور ایک صاحبزادے مولوی فریدالدین ماشاء اللہ فارغ التحصیل عالم ہیں۔ جوان صالح اور عابد و زاہد ہیں۔ سندھ پاکستان میں ایک عربی مدرسے میں مدرس ہیں۔

مولوی سعیدالدین کی تبلیغی خدمات بہت زیادہ ہیں۔ آخر دم تک آپ مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ (بستی نظام الدین دہلی) سے اور ان کی جماعت سے وابستہ رہے۔

راس المحدثین حضرت مولانا محمد انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ

آپ ۲۷ شوال ۱۲۹۲ھ ۱۸۷۵ء کو موضع وودھوان (علاقہ لولاب کشمیر) میں

پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی مولانا محمد معظم شاہ ہے۔ آپکا سلسلۂ نسب حضرت امام اعظم سیدنا ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل فرمائی ۱۳۰۵ھ میں ضلع ہزارہ پہنچ کر متعدد علماء سے تعلیم حاصل کرتے رہے ۱۳۱۰ھ میں بعمر ۱۳ سال دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے۔ ۱۳۱۴ھ میں حضرت شیخ الہندؒ سے حدیث کی تکمیل کے بعد گنگوہ تشریف لے گئے۔ اور حضرت امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہی سے سند حدیث کے علاوہ فیوض باطنی حاصل کیے۔ پھر بجنور میں مولوی مشیت اللہ بجنوری نے آپ کو بلالیا۔ ۱۳۱۵ھ میں مولوی امین الدین صاحب بانی مدرسہ امینیہ آپ کو دہلی لے آئے، اور مدرسہ کا صدر مدرس بنایا۔ آپ یہاں تقریباً ساڑھے چار سال رہے۔ اس دوران میں آپ کے بڑے بھائی کا انتقال ہوگیا۔ آپ کے والد کو بے حد صدمہ ہوا اور انھوں نے خانقاہ کی جانشینی اور خاندانی امور دین معاونت کے لئے آپ کو مستقل طور پر وطن میں واپس آجانے کا حکم دیا۔ والد کے حکم سے مجبور ہو کر آپ ۸ ربیع الاول ۱۳۲۰ھ کو وطن تشریف لے گئے (آپ کے ایک بھائی کا نام عبداللہ شاہ اور ایک کا نام سلیمان شاہ تھا، بڑے بھائی کا نام اس وقت راقم الحروف کو یاد نہیں ہے)۔

علمی ذوق اور دینی شغف کی وجہ سے آپ کو وطن کی سکونت سے روحانی اذیت محسوس ہوتی تھی، پھر آپ بارہ مولہ میں آکر کسی مدرسہ میں درس و تدریس میں مشغول ہوئے۔ مگر وہاں بھی روح کو تسکین نہ تھی، چنانچہ اپنے ایک مکتوب ۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۷ جون ۱۹۰۹ء میں تحریر فرماتے ہیں:۔

" میں کوئی ایک مہینہ گذرا چاہتا ہے کہ مکان سے بعزم ہندستان

رخصت لے کر آگیا ہوں، ہرچند کہ والدین تو راضی نہ تھے، مگر میرے الحاح پر اجازت دیدی، یہاں بارہ مولہ پہنچ کر کچھ توقف سا ہو گیا حقیر کو یہاں سے دل برداشتگی کا سبب یہ ہے کہ یہاں آکر لوگوں کی بدمعاملگی کا زیادہ احساس ہوتا رہا۔ اتنا احساس مجھے ہندوستان میں نہیں ہوا۔ پھر اگر مجھے مخلوق کی طرف احتیاج مخالطت کی ہوتی تو لامحالہ یہ احساس کم ہوتا، مگر تجرد کے باعث یہ احساس کم نہیں"

(ملتقطاً و مختصراً)

سنہ ۱۳۲۲ھ میں آپ نے حج کیا۔ واپس آکر بارہ مولہ میں مدرسہ فیض عام کی بنیاد ڈالی۔ پھر دارالعلوم دیوبند کے جلسۂ دستار بندی منعقدہ ۱۷، ربیع الثانی سنہ ۱۳۲۸ھ مطابق ۱۷، ۱۸، ۱۹ اپریل سنہ ۱۹۱۰ء میں مدعو کیے گئے۔ اور دیوبند ہی میں اقامت اختیار فرمالی، حضرت شیخ الہند نے اپنی وفات سے ۲ سال قبل سنہ ۱۳۳۶ھ میں آپ کو شیخ الحدیث کے عہدے پر اپنا جانشین بنا دیا تھا۔ اسی سال حضرت شیخ الہند کے ایما سے گنگوہ کے ایک معزز خاندان میں آپ کی شادی ہوئی۔

سنہ ۱۳۴۶ھ میں دارالعلوم کے ارباب حل و عقد سے کچھ اختلافات رونما ہونے کی بنا پر آپ اور آپ کے ساتھ بہت سے علماء و طلباء دارالعلوم دیوبند سے قطع تعلق کر کے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل تشریف لے گئے۔ ۲ صفر سنہ ۱۳۵۲ھ کو دیوبند میں آپ کی وفات ہوئی اور وہیں آپ کا مزار ہے۔

آپ کی متعدد اہم اور ٹھوس تصانیف شائع ہو چکی ہیں، علمائے عصر میں آپ کے تبحر علمی اور علم و فضل کا جو درجہ تھا اس کو ضبط تحریر میں لانا آسان نہیں ہے، آپ کی سوانح عمری نفحۃ العنبر کے نام سے شائع ہو چکی ہے، اس لیے

اسی قدر پر اکتفا کرتا ہوں ۔

قدوۃ المحدثین حضرت مولانا الحافظ ضیاء الحق دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ

آپ مولانا سراج الحق کے فرزند تھے، محلہ ابو المعالی دیوبند کے باشندے اور ایک معزز خاندان کے فرد تھے ۔ سنہ ۱۳۱۴ھ میں حضرت مفتی اعظم کے ساتھ ہی دار العلوم سے فارغ ہو چکے تھے، مگر آپ نے مزید ایک سال دار العلوم میں رہ کر کچھ کتابیں پڑھیں ۔ مولانا امین الدین نے جب مدرسہ امینیہ جاری کیا، تو آپ کو بھی دیوبند سے بلا لیا، اور مدرس دوم مقرر کیا، اپنی فراغت تعلیم اور بنائے مدرسہ کے بعد سے وفات تک مسلسل ۵۸ سال آپ نے مدرسہ کی خدمت کی ۔

ابتداء میں تنخواہ مقرر نہیں تھی، صرف خوراک کے لئے چار پانچ آنے لے لیا کرتے تھے ۔ سنہ ۱۳۱۹ھ میں یعنی تقریباً چار سال کے بعد آپ کی تنخواہ بارہ روپئے ماہوار مقرر ہوئی ۔ آپ ہمیشہ مولانا امین الدین اور حضرت مفتی اعظم کے شریکِ کار اور ہمنوا رہے ۔ حضرت مفتی اعظم کو بھی آپ کی دیانت و خلوص پر اعتماد تھا ۔ سنہ ۱۳۴۴ھ میں جبکہ حضرت مفتی اعظم حج و زیارت اور شرکت مؤتمر کے لئے حجاز تشریف لے گئے تھے، مولانا نے ہی مدرسے کے انتظامات کو عمدگی سے انجام دیا، اور حدیث کا درس دیا، اسی طرح سنہ ۱۳۴۹ھ اور سنہ ۱۳۵۰ھ کی دو مرتبہ کی اسیری کے موقع پر اور سنہ ۵۷ھ میں سفر مصر (بغرض شرکت مؤتمر فلسطین) کے موقع پر مولانا کو ہی اپنا قائم مقام بنایا تھا ۔

سنہ ۱۳۵۰ھ میں جب کہ حضرت مفتی اعظم نیو سنٹرل جیل ملتان میں اسیر

ذنگ تھے۔ مولانا مدرسے میں اہتمام اور صدر مدرسی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اس نیابت کی وجہ سے آپ کی تنخواہ ۵۵ روپئے ماہوار سے ۶۵ روپیہ ماہوار کر دی گئی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد حضرت مفتی اعظم نے جیل سے آپ کو تحریر فرمایا کہ جمادی الثانی سے آپ ۷۰ روپیہ ماہوار لیا کریں۔ اس کے جواب میں مولانا نے لکھا:۔

"آپ نے جو بندہ کو ۷۰ روپیہ کے بارے میں تحریر فرمایا ہے میں مشکور ہوں، مگر عرض یہ ہے کہ واقعی بلا انکسار میں اب ۶۵ روپیہ کے بھی قابل نہیں ہوں۔ میرا دل یہی چاہتا تھا کہ اپنی سابقہ تنخواہ ۵۵ روپیہ ہی پر کام کرتا رہوں مگر آپ کے امر سے مجبور ہو کر ۶۵ روپئے قبول کر لیے تھے۔ اور میں اپنے قویٰ میں ضعف کا احساس کرتے ہوئے خیال کرتا ہوں کہ اب میں ۶۵ روپیہ کے لائق کام نہیں کر سکتا۔"

اس کے جواب میں حضرت مفتی اعظم تحریر فرماتے ہیں:۔

"آپ ضرور ۷۰ روپیہ ماہوار کے حساب سے تنخواہ لیں۔ اور اس میں زیادہ اصرار نہ فرمائیں، میں اگرچہ جیل میں بیٹھا ہوں لیکن دہلی بلکہ مدرسے کی موجودگی کی ہی طرح مجھ کو خیال ہے۔ اور سوائے اس کے کہ جسمانی بُعد ہے، اور تعلیم کی خدمت سے محروم ہوں اور کوئی چنداں تفاوت نہیں ہوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کون شخص اس وقت کس سلوک کا مستحق ہے۔ اگر میں اس میں کوتاہی کردوں، تو یہ میری تقصیر ہوگی، آپ کے ایثار کا شکریہ! لیکن جو بات میں نے بہتر سمجھی ہے۔ اسے آپ بھی قبول کیجئے۔"

ان حضرات نے جس طرح پیٹ پر پتھر باندھ کر دین کی خدمت کی ہے

ہم ان قربانیوں کا تصور بھی نہیں کر سکتے، ان کو کام کرنے کی دھن اور ایک مقصد عظیم کی لگن تھی، معاوضہ یا تنخواہ کی پروا اور صلہ کی تمنا نہ تھی، ہر حال میں خوش رہتے تھے۔ تنگدستی اور فقر کی حالت میں بھی دامن مقصد کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ اور بڑی سے بڑی نوکری کو ٹھکرا دیتے تھے۔

ایک دولت مند نے اپنے فرزند کو پڑھانے کے لئے آپ سے درخواست کی اور پچیس روپیہ ماہوار دینے کا وعدہ کیا۔ آپ نے فرمایا گھر پر پڑھانے کے لئے نہیں آؤنگا، میرے پاس مدرسہ میں بھیج دیا کرو، بغیر کسی معاوضہ کے پڑھا دوں گا۔ اس قسم کے سیکڑوں واقعات ہمارے اسلاف کی زندگی میں ملتے ہیں۔ ان کے استغنا اور خلوص و ایثار کے مقابلہ میں ہماری اغراض پرستی پر نظر کرو تو عبرت ہوتی ہے۔

آپ ابتداء سے ہی مدرسہ کے دارالاقامہ میں قیام پذیر رہے، اور وفات بھی یہیں ہوئی۔ بہت خوش اخلاق، منکسر المزاج اور خوش پوش تھے۔ کپڑے ہمیشہ صاف ستھرے زیب تن فرماتے تھے، سب سے خلوص اور بے تکلفی کے ساتھ ملتے تھے۔ روزانہ کا معمول تھا کہ نماز عصر کے بعد پھاٹک کے حوض پر بیٹھ جاتے تھے۔ اور اذان مغرب تک حفظ تلاوت فرماتے تھے۔ تہجد گزار اور ذاکر و شاغل تھے۔ آپ کے والد مولانا سراج الحق امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے خلیفہ تھے۔ اور آپ خود اپنے والد سے مجاز تھے مگر کبھی آپ نے کسی کو بیعت نہیں کیا۔ اور ہمیشہ اس اجازت کو بھی پوشیدہ رکھا۔ زندگی کا جو معیار شروع میں قائم کیا تھا، آخر تک اسی پر قائم رہے۔ معمولی سادہ طرز زندگی کے مصارف سے جو کچھ بچتا تھا وہ ان امدادوں میں خرچ ہوتا تھا، جو ضرورت مند اقارب کی مقرر کر رکھی تھیں، اور اس راز کا انکشاف اب

آپ کی وفات کے بعد ہوا۔
انقلاب ۱۹۴۷ء میں آپ چند طلبہ کے ساتھ مدرسے میں محصور رہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ دہلی کے کوچہ و بازار میں قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ اور کسی جگہ مسلمانوں کی جان محفوظ نہ تھی، مگر اللہ سے ڈرنے والے پھر کسی سے نہیں ڈرتے۔
حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے مرض وفات کے دوران میں آپ بہت متفکر رہتے تھے۔ فرماتے تھے کہ میں بھی اب چلنے والا ہوں۔ اللہ اللہ! رفاقت کا نباہنا اس کو کہتے ہیں۔ پچاس برس دونوں حضرات ایک جگہ شریک کار رہے۔ حضرت مفتی اعظم کی وفات کے بعد مدرسہ کی مجلس منتظمہ نے آپ کو صدر مدرس کے عہدے پر مقرر کیا تھا۔
اپنی وفات سے چند روز قبل راقم الحروف سے فرمایا کہ اب میں کمزور ہوگیا ہوں، جہاں تک ہو سکے جلد صدر مدرسی کے لئے کسی قابل آدمی کو تلاش کر کے میرا کام ہلکا کرو، میں نے عرض کیا کہ حضرت آپ ایسی باتیں کر کے ہمارا دل نہ توڑیئے۔ آپ کی موجودگی میں کسی صدر مدرس کی ضرورت نہیں۔ البتہ ایک مدرس کا اضافہ آپ کے مشورہ و ہدایت کے مطابق کیا جائے گا۔ آپ کو ہم نہیں چھوڑیں گے۔ فرمایا کہ میری بھی یہی آرزو تھی کہ مدرسے کی خدمت کرتے کرتے پیغام اجل آجائے لیکن ضعف کی وجہ سے کام کرنے کے قابل نہیں ہوں۔
مورخہ ۲۸ رجب ۱۳۷۳ھ کو صبح دس بجے آپ حدیث شریف کا درس دے رہے تھے، یکایک طبیعت میں کچھ امتلائی کیفیت پیدا ہوئی مگر آپ برداشت کرتے رہے۔ سبق ختم کر کے ساڑھے دس بجے کے قریب

آپ اپنے کمرے میں تشریف لے گئے۔ استفراغ ہوا۔ اور بے انتہا نقاہت ہو گئی، تین دن یہ کیفیت رہی بکیم شعبان ۱۳۷۳ھ بوقت ۹ بجے شب نمازِ عشاء سے فارغ ہو کر داعی اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وفات کے وقت آپ کی عمر ۸۳ سال تھی، یعنی آپ حضرت مفتی اعظمؒ سے دو سال بڑے تھے۔ آپ دہلی میں حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے مزارِ مبارک کے قریب مدفون ہیں۔

تاج الفقہاء والمحدثین حضرت مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ

آپ کا وطن مالوف شاہ جہاں پور (محلہ سن زئی) ہے۔ اس شہر کو عمدۃ الملک نواب بہادر خاں نے ۱۰۴۷ھ میں صاحبقران ثانی شاہ جہاں بادشاہؒ کے عہد میں آباد کیا تھا۔ آپ کے والد ماجد کا نام شیخ عنایت اللہ بن فیض اللہ بن خیر اللہ بن عباد اللہ ہے۔ آپ کا سلسلۂ نسب شیخ جمال یمنی سے جا کر ملتا ہے۔ یعنی آپ کا اجدادی وطن جزیرۃ العرب کا ساحلی علاقہ یمن ہے۔ یہ لوگ موتیوں کی تجارت کرتے تھے۔ بحرین سے موتی حاصل کر کے ہندوستان، لنکا وغیرہ کے ساحلی علاقوں میں لا کر فروخت کرتے تھے۔

قدیم زمانے میں یمن سے اسی طرح سوداگروں کا ایک قافلہ جہاز پر سوار ہو کر سمندر کی سطح پر روانہ ہوا۔ ہندوستان کے ساحل پر پہنچنے سے قبل طوفان نے آگھیرا۔ جہاز ٹوٹ پھوٹ گیا۔ مسافر غرق ہو گئے۔ سالارِ قافلہ کا کمسن لڑکا جس کا نام جمال تھا بچ گیا۔ اور ساحل سے اس کو ایک شخص جو بھوپال کا باشندہ تھا اپنے ساتھ لے آیا۔ وہ لڑکا اسی کی زیر تربیت رہا اور اس نے اپنے ہی خاندان میں اس کی شادی کر دی۔ یہی شیخ جمال حضرت

مفتیٔ اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے مورث اعلیٰ ہیں ۔

آپ کا سن پیدائش ۱۲۹۲ھ ہے ۔ مکتبی تعلیم سے فارغ ہوکر عربی کی ابتدائی تعلیم مدرسہ اعزازیہ شاہجہانپور میں داخل ہوکر مولوی حافظ بدھن خاں اور مولوی عبید الحق خاں سے حاصل کی ۔ پھر مولوی عبید الحق خاں کے اصرار اور کوشش سے مرادآباد کے مدرسہ شاہی میں تشریف لے گئے ۔ اور اس کے بعد دارالعلوم میں جاکر ۱۳۱۵ھ ۱۸۹۷ء میں فارغ التحصیل ہوئے ۔

آپ نے دورۂ حدیث مولانا عبد العلی میرٹھیؒ اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ سے اور بقیہ کتابیں مندرجۂ ذیل اساتذہ سے پڑھیں ۔ مولانا منفعت علی صاحب، مولانا حکیم محمد حسن صاحب (برادرِ خورد شیخ الہند) مولانا غلام رسول صاحب، مولانا خلیل احمد صاحب انبیٹھوی ۔

مولانا عبید الحق خاں جو مدرسہ اعزازیہ سے اختلاف عقائد کی بنا پر یکسوئی اختیار کر چکے تھے، اور سنہ ۱۳۱۴ھ میں مدرسہ عین العلم کی بنیاد رکھ چکے تھے، انہوں نے آپ کو بلالیا ۔ آپ تقریباً پانچ سال وہاں مدرس رہے ۔ اور افتاء کا کام بھی کرتے رہے ۔ ایک دینی رسالہ البرہان کے نام سے جاری کیا ۔

جیسا کہ گذشتہ سطور میں عرض کیا جاچکا ہے تیرھویں صدی ہجری کے وسط میں دہلی کے مسلمانوں کی تہذیب و معاشرۃ بہت گر رہی تھی اور سیاسی مرکزیت کے ساتھ دینی مرکزیت بھی زوال پذیر تھی، بدعات کی گرم بازاری تھی ۔ عیش و عشرت ترقی پذیر تھا، خالص دین مٹتا جارہا تھا، پھر سنہ ۱۲۷۳ھ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے تو اسلامی شعائر کو تباہ ہی کردیا، حقیقت نگر نگاہیں خاندانِ ولی اللّٰہی کے ختم ہونے کے بعد دہلی کے مطلع پر کسی بدرِ کامل

کی منتظر تھیں، بارگاہ صمدیت اپنے پوشیدہ انتظام میں مصروف تھی، آخر اسی خاندان کے خوشہ چینوں میں سے ایک ہستی کو قدرت نے دہلی کے لئے چن لیا، اور وہ اپنی پیشانی میں ولی اللہی انوار لئے ہوئے آسمان دہلی کے افق پر نمودار ہوا۔ اس بدرِ کامل سے ہماری مراد حضرت مفتیٔ اعظم کی ذات اقدس ہے۔

مولانا امین الدین شروع سے ہی آپ کو دہلی بلانا چاہتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے مولانا عبید الحق خاں سے دہلی جانے کی اجازت چاہی مشفق اور قدر داں استاد نے کہا کہ آپ ترقی پر دہلی جا رہے ہیں۔ اللہ مبارک کرے! جائیے! لیکن اگر میدانِ حشر میں مجھ سے سوال ہوا کہ تم نے کیوں مولوی کفایت اللہ کو چھوڑ دیا؟ تو کیا جواب دونگا؟ آپ نے فوراً دہلی جانے کا خیال ترک کر دیا۔

۱۳۲۱ھ (۱۹۰۳ء) میں مولانا عبید الحق خاں کی وفات ہو گئی، مولوی امین الدین شاہجہاں پور تشریف لے گئے۔ اور آپ ہی کے مکان پر قیام فرمایا، اور آپ کو دہلی آنے پر آمادہ کر لیا۔ آپ شوال ۱۳۲۱ھ میں دہلی تشریف لائے۔ اور صدر مدرس و مفتی کے عہدے پر مامور ہوئے۔

آپ کے بارے میں آپ کے اولین استاد مولانا عبید الحق کے تاثرات کا اندازہ سطور بالا سے ہو گیا ہوگا حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں اپنے ہونہار اور قابل شاگرد کی جو قدر و منزلت تھی وہ مولانا قاری محمد طیب دام مجدہٗ مہتمم دار العلوم دیوبند کے الفاظ میں سنیئے: الجمعیۃ کے مفتیٔ اعظم نمبر میں تحریر فرماتے ہیں۔

"حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے جب انگریزوں سے ترک موالات کرنے کا استفتاء پیش کیا گیا تو غایت انکسار نفس اور حدود شناسی کے ساتھ فرمایا کہ مجھے انگریزوں سے غیر معمولی

بغض و نفرت ہے۔ ان کے بارے میں فتویٰ دینے میں مجھے اپنے نفس پر اعتماد نہیں ہے کہ وہ حدود کی رعایت رکھ سکے۔ درانحالیکہ قرآن کا فیصلہ ہے کہ اعدلوا ھو اقرب للتقوٰی۔ اور یہ فرماکر اپنے مخصوص تلامذہ میں سے فتویٰ لکھنے کے لئے جن تین حضرات کا نام لیا، ان میں اولین نام حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تھا، گویا حضرت کو اپنے نفس پر اس بارے میں اتنا اعتماد نہ تھا جتنا ان پر تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اپنے نفس پر بے اعتمادی عین کمال بلکہ منتہائے کمال اور احتیاط و تقویٰ کی اعلیٰ ترین مثال ہے، اور اسلئے فتویٰ صادر فرمانا دراصل ایسے ہی اہل اللہ کا حق تھا۔ مگر اسی سے ظاہر ہے کہ ایسے اکابر جن پر خود اعتماد فرمائیں، اور اپنے مقابلے میں اعتماد کا اظہار فرمائیں وہ کتنے محتاط اور متدین ہوں گے۔"

مولانا سید محمد میاں صاحب دام مجدہٗ اپنی کتاب علمائے حق حصہ اول میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب نے جمعیۃ علمائے ہند کے گیارھویں اجلاس منعقدہ دہلی میں ایک تقریر کے ضمن میں فرمایا کہ حضرت شیخ الہند ؒ نے وصیت فرمائی تھی کہ ارکانِ جمعیۃ علمائے ہند کو دو آدمیوں کو کبھی نہ چھوڑنا چاہئے۔ ایک مولانا حبیب الرحمٰن دوسرے مولانا کفایت اللہ"

یہ دینی درسگاہ (مدرسہ امینیہ) جس کی بنیادیں اخلاص و توکل پر استوار کی گئی تھیں۔ اس میں بیٹھ کر حضرت مفتی اعظم ؒ نے پچاس برس حدیث کا درس دیا۔ اور احکام شریعت کی اشاعت فرمائی۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ آپ نے

فقہ کو از سرِ نو مرتب و مدون کیا تو بیجا نہ ہوگا۔ آپ کے فتاویٰ کا عظیم الشان ذخیرہ جزئیات فقہ کا خزانہ اور ملت بیضاء کی لازوال دولت ہے۔ راقم الحروف آپ کے فتاویٰ کی تبویب و ترتیب کر رہا ہے۔ اگر مسلمانوں نے اس کمترین کی کچھ ہمت افزائی فرمائی تو انشاء اللہ یہ علمی ذخیرہ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو جائے گا۔

درسِ حدیث میں آپ کا اندازِ بیان اپنے شیخ کے مشابہ تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا حضرت شیخ الہند تقریر فرما رہے ہیں۔

بیس روپے ماہوار کی تنخواہ پر دہلی تشریف لائے تو

۱۳۷۰ھ میں آپ کی تنخواہ دو سو پچاس

۱۳۷۰ھ سے مجلس منتظمہ

آپ

یں لونگا۔

بدلی مجلس شوریٰ کی رکنیت

غرض کہ کوئی دینی، ملی اور س

اصابت رائے سے بے نیا

مسیح الملک حکیم

آپ کا کچھ منصب بھی

آپ کفایت

دینی کاموں

بیر احمد عثمانی قدس

رفیق سفر تھے، فرمایا کرتے

طور

پر ہم اسی سفر میں واقف ہوئے، ان

ظرفی کے

جو مناظر بچشم خود دیکھے وہ حیرت انگیز

تدبر، صبر و رضا، تفقہ فی الدین

پ کا درجہ و مقام اتنا بلند ہے

را کچھ تھوڑا سا آپکی

تمائے امت نے جہاں اپنی

محنت و جانفشانی سے روایت

صحیحہ کی حفاظت فرمائی، کیونکہ اسی پر دین خالص کا مدار ہے، وہاں قوم وملت

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ

ہیں۔ تاریخ اس امر کی

اس قدر رشدید تھا، ان کے

جانشین سلسلہ وار اس فرض کو انجام دیتے رہے۔ اس سلسلہ کے نمایاں

فقہ کو از سرنو مرتب و مدون کیا تو بیجا نہ ہوگا۔ آپ کے فتاوٰی کا عظیم الشان ذخیرہ جزئیات فقہ کا خزانہ اور ملت بیضاء کی لازوال دولت ہے۔ راقم الحروف آپ کے فتاوٰی کی تبویب و ترتیب کررہا ہے۔ اگر مسلمانوں نے اس کمترین کی کچھ ہمت افزائی فرمائی تو انشاء اللہ یہ علمی ذخیرہ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو جائے گا۔ درس حدیث میں آپ کا انداز بیان اپنے شیخ کے مشابہ تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا حضرت شیخ الہند تقریر فرمارہے ہیں۔

بیس روپے ماہوار کی تنخواہ پر دہلی تشریف لائے تھے۔ جمادی الاول ۱۳۷۰ھ میں آپ کی تنخواہ دوسو پچاس روپئے ماہوار تھی۔ یکم جمادی الثانی ۱۳۷۰ھ سے مجلس منتظمہ نے پچیس روپئے کا اضافہ کرکے دوسو پچہتر کردی۔ آپ نے فرمایا کہ مدرسے کی آمدنی کم ہورہی ہے اس لئے میں اضافہ نہیں لونگا۔ اور اپنی وفات تک پچیس روپئے ماہوار مدرسے کو واپس دیتے رہے۔ مدرسے کے لئے آپ نے اپنی زندگی وقف کردی تھی۔ بڑی سے بڑی ملازمت کو کبھی قبول نہیں فرمایا۔ جس وقت آپ کی تنخواہ چالیس پچاس روپئے سے زیادہ نہ تھی۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں آپ کو مبلغ پانسو روپئے ماہوار پر بلایا گیا، آپ نے انکار فرمایا اور فرمایا کہ وہاں ضمیر کی آزادی میسر نہ ہوگی اور یہاں دین کی خدمت میں رکاوٹ بنے گی۔

آپ طویل عرصے تک مدرسہ عالیہ فتحپوری کے بھی مہتمم رہے۔ یعنی بیک وقت آپ بہت سے اداروں کے رکن رکین اور امور مہمہ میں دخیل تھے۔ جمعیۃ علمائے ہند کی تاسیس و صدارت کے علاوہ مدرسۂ امینیہ اور مدرسہ فتحپوری کی انتظامی ذمہ داری، اور مسلم یونیورسٹی کی مجلس منتظمہ کی رکنیت، خلافت کمیٹی کی رکنیت و صدارت، آل انڈیا نیشنل کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کی رکنیت، دارالعلوم دیوبند کی مجلس شورٰی کی رکنیت

غرض کہ کوئی دینی، ملی اور سیاسی ادارہ ایسا نہ تھا جو آپ کے فہم وتدبر اور اصابت رائے سے بے نیاز ہو۔

مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کی تحریک سے نظام دکن نے آپ کا کچھ منصب بھی مقرر کیا تھا۔ مگر آپ نے اس کا اجراء نہیں کرایا، ذاتی مصارف میں آپ کفایت شعاری سے خرچ کرتے تھے۔ لیکن دوستوں پر اور قومی و دینی کاموں میں فراخدلی سے خرچ کرتے تھے حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی قدس سرہٗ، جو مؤتمر حجاز منعقدہ ۱۳۴۴ھ ۱۹۲۵ء میں آپ کے رفیق سفر تھے، فرمایا کرتے تھے کہ "مفتی صاحب کے فضائل سے صحیح طور پر ہم اسی سفر میں واقف ہوئے، ان کی فیاضی، سیر چشمی اور عالی ظرفی کے جو مناظر بچشم خود دیکھے وہ حیرت انگیز تھے۔"

غرض کہ علم وفضل، زہد وتقویٰ، فہم وتدبر، صبر ورضا تفقہ فی الدین وغیرہ اوصاف حمیدہ اور مکارم اخلاق میں آپ کا درجہ ومقام اتنا بلند ہے کہ مجھ جیسا ہیچمداں قلم اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ لہٰذا کچھ تھوڑا سا آپکی سیاسی زندگی کے بارے میں عرض کرتا ہوں۔

قومی ہمدردی اور ملّی خدمات

علمائے امت نے جہاں اپنی محنت وجانفشانی سے روایت صحیحہ کی حفاظت فرمائی، کیونکہ اسی پر دین خالص کا مدار ہے، وہاں قوم وملّت کی سیاسی رہنمائی سے بھی غافل نہیں رہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ جو ہندوستان میں سلسلۂ روایت کے مورث اعلیٰ ہیں۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ ان کے دل میں قومی وملّی احساس کس قدر شدید تھا، ان کے جانشین سلسلہ وار اس فرض کو انجام دیتے رہے۔ اس سلسلہ کے نمایاں

ہیرو مولانا اسماعیل شہید اور مولانا سید احمد بریلوی ہیں۔ ان کی ناکامی کے بعد ۱۸۵۷ء میں ایک زبردست جنگ آزادی لڑی گئی۔ جس کا ہیرو آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر (خلد آشیاں) کو بنایا گیا تھا۔ اور علمائے امت نے اس میں شرکت اور تعاون کیا تھا، مگر افسوس کہ اس جنگ میں بھی ناکامی ہوئی اور نتیجے کے طور پر جن علماء نے جہاد کے فتوے پر دستخط کیے تھے وہ قید کیے گئے، جلا وطن کیے گئے، یا پھانسی پر چڑھائے گئے۔ مثلاً مولانا فضل حق خیر آبادی وغیرہ کو قید کر کے جزائر انڈمان بھیج دیا گیا، اور وہیں ان کی وفات ہوئی، حضرت مفتی صدر الدین آزردہ ایک نکتہ کی وجہ سے سزائے موت سے تو بچ گئے، مگر جائداد ساری ضبط ہو گئی تھی۔ نکتہ یہ تھا کہ آپ نے اپنے دستخط کے ساتھ لفظ بالجبر بے نقط لکھ دیا تھا۔ فوجی عدالت میں جب آپ کا مقدمہ پیش ہوا تو آپ نے عدالت کے سوال کرنے پر فرمایا کہ مجھ سے جبریہ دستخط لیے گئے۔ دیکھئے میں نے اپنے دستخط کے ساتھ لفظ بالجبر لکھا ہے۔ عدالت نے لاجواب ہو کر آپ کو سزائے موت سے بری کر دیا۔

مرزا غالب کے لطائف میں ایک لطیفہ مذکور ہے کہ ایک مرتبہ مرزا غالب کے قدیم احباب میں سے ایک معزز اور صاحب وجاہت دوست مرزا سے ملنے آئے۔ جو کسی زمانے میں بڑے دولت مند اور ذی حیثیت تھے، ایک زمانہ وہ تھا کہ حویلی اور دیوان خانے میں اندر سے باہر تک ایرانی قالین بچھے رہتے تھے اور ڈیوڑھی پر ہاتھی جھومتے تھے۔ ایک زمانہ یہ آیا کہ مرزا سے ملنے آئے تو فرغل پہنے ہوئے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر مرزا کے دل پر چوٹ لگی۔ کچھ دیر کے بعد جب وہ جانے لگے تو مرزا نے ان کے فرغل کی تعریف کرنی شروع کی، اور اس کی تعریف و تحسین میں بے حد مبالغہ کیا اور دریافت

کیا کہ آپ نے اس کی چھینٹ کہاں سے خریدی ؟ میں بھی بنواؤں گا، انھوں نے کہا کہ اگر آپ کو پسند ہے تو نذر کرتا ہوں، اور اتار کر فرغل مرزا غالب کو دے دیا۔ مرزا نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ سردی کا وقت ہے دولت خانے تک تشریف لے جانے میں تکلیف ہوگی۔ آپ یہ چوغہ پہن کر جائیے اور اپنا بیش قیمت اونی چوغہ ان کو دے دیا۔ مرزا نے اس خوبصورتی سے فرغل کا تبادلہ کرکے ان کے دل میں احساس کمتری پیدا نہیں ہونے دیا۔ وہ کون ذی وجاہت دوست تھے ؟ تذکرہ نویس نے ان کی عظمت کے لحاظ سے اُس وقت ان کا نام ظاہر نہیں کیا تھا۔ واقفکار حضرات کو معلوم ہے کہ وُہ حضرت مفتی صدر الدین خاں آزردہ تھے۔ جو حضرت مفتی اعظم رح کے اساتذہ کے سلسلے میں داخل ہیں۔

بہرحال دار وگیر سے بچنے والے علماء یا تو گوشہ نشین ہو کر زندگی کے دن پورے کرنے پر مجبور ہوگئے یا انگریزوں کی مدح سرائی و قصیدہ خوانی میں مشغول ہوگئے، اور حکومت کے پروپیگنڈے میں اپنی تمام قابلیت صرف کرنے لگے۔ (اور ہر نئی طاقت کے غلبہ کے وقت ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے) باقی علماء کو انگریز کی خاموش پالیسی نے مناظرے بازی میں الجھا دیا۔ (اور اس طوفانی زمانے میں پادریوں کی یورش کی مدافعت بھی ضروری تھی) غرض کہ کسی قسم کی بغاوت تو کیا حقوق طلبی کا خیال کرنا بھی سانپ سے کھیلنا تھا۔

مگر دردمند اور بیدار مغز علماء کا دل اس درد سے خالی نہ تھا۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے تلامذہ ملک کو آزاد کرانے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔

اتحاد مدارس کی تحریک

مدرسۂ امینیہ کے سالانہ جلسے منعقدہ ۷ ر ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۲ ر فروری ۱۹۰۴ء میں حضرت مفتیٔ اعظم قدس سرہ نے مندرجۂ ذیل خیالات کا اظہار فرمایا:۔

"اس وقت بالخصوص چند امور خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں۔ ان پر غور فرمانے اور ان کے بارے میں مناسب مشورہ دینے کی اہلِ رائے سے درخواست کرتا ہوں۔ وہ ایسے امور ہیں جن کیلئے مجموعی طاقت کی ضرورت ہے۔ کسی ایک شخص کے کرنے کے نہیں ہیں، اور وہ باتیں معمولی باتیں نہیں ہیں۔ اول یہ کہ یہ بات ظاہر ہے کہ مدارس اسلامیہ جس قدر ہیں سب کا مقصود ایک ہے۔ یعنی علم دین کے باغ کی آبیاری، یہ مختلف مدارس اس باغ کی چھوٹی چھوٹی کیاریاں ہیں اور ہم ان کے باغبان ہیں۔ تو جیسا کہ سب کا مقصود ایک ہے، اسی طرح ان سب کی کوشش اور سعی بھی ایک طرز پر ہونی چاہیئے" (ملخصاً)

یہ ایک ابتدائی تخیل تھا کہ تمام مدارس اسلامیہ کو ایک لڑی میں منسلک کر دیا جائے، مختلف الخیال علماء کا ایک مرکز پر متفق ہو جانا کتنا دشوار امر تھا۔ اس سلسلے میں مدرسۂ امینیہ نے سب سے پہلی اور سب سے بڑی قربانی پیش کی اور اس میں کامیابی کی پہلی منزل یہ تھی کہ دارالعلوم دیوبند نے سب سے پہلے اس آواز پر لبیک کہی۔ روئداد مدرسۂ امینیہ (۱۳۲۵ھ) میں مندرجۂ ذیل الفاظ میں جس کا اظہار کیا گیا ہے:۔

اتحاد مدارس۔ کارکنان مدرسۂ امینیہ کو مدت سے یہ خیال تھا کہ عربی پڑھنے والے طلبہ کے داخلہ کا انتظام بہت باضابطہ اور

قواعد پر مبنی ہو۔ ان کی یہ مطلق العنانی کہ جہاں چاہا چل دیئے اور جو چاہا پڑھا تعلیم کو سخت مضرت پہنچا رہی ہے "

اہل مدرسہ اس کی فکر اور کوشش سنہ ۱۳۲۲ھ سے کر رہے تھے۔ مدرسہ امینیہ کی سالانہ روئداد متعلقہ سنہ ۱۳۲۲ھ کے ص ۶۵ سے ص ۶۶ تک یہ مضمون بہت زور کے ساتھ لکھا گیا ہے اور پھر ۱۳۲۷ھ کے جلسے کی مختصر مطبوعہ روئداد کے ص ۶ پر بھی اس کا تذکرہ کیا گیا اور مدارس اسلامیہ کے مہتممین کی خدمات میں عرض کیا گیا کہ آپس میں اتفاق کر کے اس کا انتظام کریں۔

"ہو بارے الحمد للہ کہ حضرات کارکنانِ مدرسہ دیوبند نے اس سے بکلی اتفاق کر کے پختہ وعدہ فرمالیا کہ مدرسۂ دیوبند اور جو مدارس کہ اس کے ساتھ ہیں ان میں کوئی ایسا طالب علم جو کسی دوسرے مدرسے سے آیا ہے اس وقت تک داخل نہ کیا جائے گا۔ جب تک کہ وہ اپنی نیک چلنی کی سند پیش نہ کرے، اگرچہ اس کا اجراء ابھی پورے طور پر نہیں ہوا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اب وہ وقت بہت قریب ہے کہ اس مبارک تجویز کی بے شمار برکتیں ہمیں اور مدارس اسلامیہ اور ان کے طلبہ کے شامل حال ہوں "

دار العلوم دیوبند کا جلسۂ دستار بندی جو سنہ ۱۳۲۸ھ میں منعقد ہوا اس کے پوسٹر کی عبارت مندرجۂ ذیل ہے:۔

مدرسۂ امینیہ دہلی کے فارغ التحصیل طلبہ کی مدرسۂ اسلامیہ دیوبند کے جلسہ میں دستار بندی

مدارس اسلامیہ کے اتحاد کا پہلا عملی نمونہ

"بالخصوص مذکورۂ عنوانِ بالا دونوں مدرسوں کے اتفاق کا دلکش

نقشہ عنقریب ہمدردانِ قوم و مذہب کے پیش نظر ہونے والا ہے۔
جن لوگوں کے پاک دل عرصے سے اتحاد و اتفاق کے مشتاق اور
آنکھیں منظرِ اتحاد کی منتظر تھیں۔ انہیں اراکین مدرسۂ دیوبند و مدرسۂ امینیہ
نہایت مسرت سے یہ مژدہ سناتے ہیں کہ مدرسۂ دیوبند کے اس عظیم الشان
جلسے میں جو ۶، ۷، ۸ ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ مطابق ۱۷، ۱۸، ۱۹
اپریل ۱۹۱۰ء کو ہونے والا ہے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی اور دل
مسرور ہو جائیں گے۔ یہ جلسہ جس طرح اور خصوصیات کی وجہ سے
ممتاز ہوگا اسی طرح اتحاد و اتفاق کے مبارک سلسلے کی ابتدا
کرنے کے لحاظ سے بھی بے مثل و بے نظیر ہوگا۔ مدرسہ امینیہ دہلی جو
خوبیٔ تعلیم و حسنِ انتظام کی جہت سے مدارس دہلی میں ایک ممتاز
مدرسہ ہے، اس کے فارغ التحصیل طلبہ میں سے منتخب علماء کی
دستار بندی اسی جلسے میں ہوگی۔ اراکین مدرسۂ دیوبند تمام اہل اسلام
اور بالخصوص ان حضرات کو جو خاص مدرسۂ امینیہ سے دلچسپی رکھتے ہیں
مبارکباد دیتے ہوئے اس مسرت بخش جلسے میں شریک ہونے کی
دعوت دیتے ہیں، اور امید کرتے ہیں کہ وہ قدوم میمنت لزوم سے
جلسے کو عزت بخشیں گے۔

المکلف:۔ محمد احمد غفرلہٗ مہتمم مدرسۂ اسلامیہ دیوبند ضلع سہارنپور
(ابن حضرت مولانا محمد قاسم نور اللہ مرقدہٗ)

ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ

۱۲۹۷
عربی دیوبند
مدرسہ اسلامی

مہر

مدرسہ امینیہ کے جن دس عدد فارغ التحصیل علماء کو دعوت دے کر اس جلسے میں بلایا گیا اور دستار بندی کی گئی ان میں حافظ سید محمد حسین (ابن پیر جماعت علی شاہ) اور حضرت مولانا حافظ سید مہدی حسن صاحب (صدر مفتی دارالعلوم دیوبند) کا نام بھی ہے۔ یہ وہی جلسہ ہے جس کے بارے میں مولانا سید محمد میاں صاحب نے علمائے حق حصہ اول کے صفحہ ۱۳۱ پر سپرد قلم فرمایا ہے کہ "جمعیۃ الانصار کے نظام کو عام ذہنوں تک پہنچانے کے لئے مناسب سمجھا گیا کہ سب سے پہلے خالص مذہبی پیرایہ میں اس کا ظہور ہو جو اس وقت کی سیاست کے لحاظ سے نہایت ہی مبصرانہ اقدام تھا"

اتحاد مدارس کی اس تحریک کا مقصد سیاسی تھا یا خالص دینی اس وقت ہمیں اس سے بحث نہیں۔ اور ہمیں اس وقت اس سے بھی غرض نہیں کہ فاضل مورخ مولانا سید محمد میاں نے جلسۂ دستار بندی کو کس رنگ میں پیش کیا لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تحریک مبہم اسباب کی بنا پر اس منزل سے آگے نہیں بڑھی۔

۱۳۳۱ھ / ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان کے مجروحین کے لئے حضرت مفتیٔ اعظمؒ نے اور آپ کے ساتھ طلبائے مدرسہ امینیہ نے چندہ جمع کیا، طلباء نے چندہ میں کتابیں، کپڑے، برتن وغیرہ بھی دے ڈالے۔ سامان جو چندہ میں جمع ہوا، اسکو حضرت نے خود بہ نفس نفیس جامع مسجد پر نیلام کیا۔ آپ کی کوشش سے جو چندہ جمع ہوا تھا، اس کی میزان تین ہزار آٹھ سو چورانوے روپئے آٹھ آنے نو پائی تھی۔

مسلمانوں کی لیڈرشپ

حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک کا بنیادی مقصد ملک کو غیر ملکی حکومت سے آزاد کرانا تھا۔ طریقۂ کار اور اسکیم یہ تھی کہ پڑوسی حکومتوں کو متحد کرکے ہندوستان پر

حملہ کے ذریعہ انقلاب پیدا کیا جائے۔ مگر فضا اس کے لئے مناسب نہ تھی، اس وجہ سے تمام کارروائی کو نہایت رازداری کے ساتھ انجام دیا جاتا تھا۔ کام نہایت خطرناک اور خالص باغیانہ تھا۔ حکومت کی نظریں جائزہ لے رہی تھیں، اور آپ کی گرفتاری بالکل قریب اور یقینی تھی۔ حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے حضرت شیخ الہند نے سفرِ حجاز کا ارادہ فرمایا اور شوال ۱۳۳۳ھ ۱۹۱۵ء میں دیوبند سے روانہ ہوگئے۔ شریف حسین حاکمِ حجاز انگریزوں سے ساز باز رکھتا تھا، اس نے آپ کو اور آپ کے رفقاء کو گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ انگریزوں نے آپ کو جزیرہ مالٹا میں لے جا کر قید کر دیا۔

ادھر ہندوستان میں سیاست کا رُخ بدل رہا تھا، ہندوؤں کے اندر سیاسی بیداری پیدا ہو چکی تھی۔ چونکہ قانون تحفظ ہند کے ذریعہ انگریزوں نے مسلمانوں کی قوت اور لیڈرشپ کو پاش پاش کر دیا تھا اس لئے ملکی سیاست کی باگ ڈور کانگریس کے ہاتھ میں منتقل ہو رہی تھی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی سب سے بڑی سیاسی جماعت (مسلم لیگ) جو ۱۳۲۴ھ ۱۹۰۶ء میں قائم ہوئی، اس کے مقاصد میں سے اولین مقصد پر غور فرمایئے۔

(۱) مسلمانانِ ہند کے دل میں برٹش گورنمنٹ کی نسبت وفادارانہ خیالات کو ترقی دینا اور گورنمنٹ کی کسی کارروائی کے متعلق ان میں جو غلط فہمی پیدا ہو اسے دُور کرنا۔

(۲) مسلمانانِ ہند کے پولٹیکل حقوق و فوائد کی نگہداشت کرنا اور ان کی ضروریات و خواہشات کو مؤدبانہ طریقے سے گورنمنٹ

کے سامنے پیش کرنا۔

(۳) لیگ کے مقاصد کو نقصان پہنچائے بغیر مسلمانانِ ہند میں ایسے خیالات پیدا نہ ہونے دینا جو دوسرے فرقوں کی نسبت معاندانہ ہوں۔ (روشن مستقبل)

۱۸۵۷ء/۱۲۷۳ھ کے بعد سے اسی طرح اظہار وفاداری کرتے ہوئے مسلمانوں پر تقریباً ۶۰ برس کا زمانہ گذر گیا، آخر ایک نئی صورت حال پیدا ہوئی۔ جنگِ عظیم کے ختم ہونے کے بعد ۱۹۱۹ء میں انگریزی حکومت کے جبر و تشدد اور مقاماتِ مقدسہ کی بے حرمتی اور ترکوں کے ساتھ بدعہدی کی وجہ سے مسلمانانِ ہند میں سخت برہمی پیدا ہوئی۔ یہ بڑا نازک اور سیاسی تدبر کی آزمائش کا وقت تھا۔ مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی صرف آئینی جد و جہد تک منحصر تھی۔ کسی قسم کا انقلابی قدم اٹھانے کے لئے نہایت احتیاط کی ضرورت تھی۔

جمعیۃ علمائے ہند کا قیام و تاسیس

۲۲ نومبر ۱۹۱۹ء کو دہلی میں خلافت کمیٹی کا اجلاس ہوا، یہ اجلاس مسٹر اے، کے فضل الحق (کلکتہ) کی صدارت میں بمقام کرشنا تھیٹر پتھر والا کنواں دہلی منعقد ہوا تھا۔ اس کے صدر استقبالیہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری تھے۔ یہ خطبہ استقبالیہ گورنمنٹ نے ضبط کرلیا تھا۔

اس اجلاس میں ہندوستان کے بہت سے علماء شریک ہوئے۔ حضرت مفتیِ اعظم نے عملی طور پر نمایاں حصہ لیا۔ اس موقع پر آپ نے یہ خطرہ محسوس کیا کہ اگر کسی سیاسی جماعت میں علماء انفرادی طور پر شریک ہوئے اور خدانخواستہ کوئی غیر محتاط قدم اٹھایا تو سب سے زیادہ آفت علماء پر آئے گی۔ اس لئے پہلے علماء کو ایک مرکز پر جمع کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ آپ نے خلافت کانفرنس

کے دوران میں علماء کے ساتھ اس قسم کے مذاکرات شروع کر دیئے۔

آپ جب سنہ ۱۹۱۸ء میں رسالہ "شیخ الہند" کی تالیف فرما رہے تھے، اس وقت سے آپ کی یہ خواہش تھی کہ شیخ الہند کی رہائی کے لئے جو کوشش کی جائے وہ ایسے پلیٹ فارم سے کی جائے جو تمام علمائے ہندوستان کا مشترکہ پلیٹ فارم ہو۔

غرضیکہ ان مذاکرات میں آپ کی رائے سے اتفاق کرنے والوں اور آپ کی پکار پر لبیک کہنے والوں میں اولین نام مولانا ابوالحسنات عبدالباری فرنگی محلی، مولانا ابوالوفا ثناء اللہ اور مولانا آزاد سبحانی کے ہیں۔ مؤخر الذکر اس معاملہ میں بہت جوش کے ساتھ تگ و دو کر رہے تھے۔

مختلف الخیال، مختلف المسلک اور مختلف العقائد علماء کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا جس قدر ضروری تھا اس سے زیادہ دشوار تھا، نیز حالات کی نزاکت اور حکومت کی کڑی نگرانی انتہائی راز داری پر مجبور کر رہی تھی۔ مشورہ یہ تھا کہ اس مقصد کے لئے علماء کی ایک میٹنگ منعقد کی جائے۔ طے پایا کہ اجلاس ختم ہونے کے بعد صرف علماء کو بلایا جائے۔ چنانچہ حضرت مفتیٔ اعظمؒ کی ہدایت کے مطابق مولانا احمد سعید اور مولانا آزاد سبحانی نے تمام علماء کی قیامگاہوں پر جاکر چپکے چپکے سب کو بلاوا دیدیا۔ خطرہ یہ تھا کہ حکومتِ برطانیہ علماء کو کبھی ایک مرکز پر جمع نہ ہونے دے گی۔ اس سلسلے میں ہر قسم کی قربانی پیش کرنے اور ہر مصیبت کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہو جانا؛ اور ملی رہنمائی کے لئے اختلاف عقائد کو نظر انداز کر کے ایک مرکز پر جمع ہو جانا بڑی مشکل بات تھی۔

میٹنگ جس روز ہونے والی تھی اس روز صبح کو بعد نماز فجر بہت سے

علماء درگاہ سید حسن رسول نما رحمۃ اللہ علیہ میں حاضر ہوئے اور دہلی کے اس مقدس بزرگ کے مزار کے قریب حاضر ہو کر یہ قول و قرار کیا کہ

"موجودہ گورنمنٹ کے خلاف ہماری کاروائیاں صیغۂ راز میں رہیں گی۔ اور حکومت کی جانب سے جو سختیاں ہم پر پہنچائینگی ان پر ہم ثابت قدم رہیں گے۔ نیز آپس میں عقائد کے اختلاف کو نہیں آنے دیں گے۔"

حضرت مولانا احمد سعید صاحب دام مجدہٗ جو اس معاہدے میں شریک تھے فرماتے ہیں:۔

"یاد نہیں کہ اس عہد و پیمان میں کون کون حضرات شریک تھے، حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا آزاد سبحانی، مولانا منیرالزمان کی موجودگی تو یاد ہے۔ مگر ان کے علاوہ اور بھی حضرات تھے۔ مطبوعہ رپورٹ میں یہ سرگذشت نہیں لکھی گئی۔ کیونکہ اس وقت کے حالات کے پیش نظر ان باتوں کا شائع کرنا مناسب نہ تھا۔ میں نے درگاہ سید حسن رسول نما سے واپس آکر حضرت مفتیٔ اعظم کو تمام کیفیت سنا دی تھی اور حضرت نے اطمینان و مسرت کا اظہار فرمایا تھا۔"

اسی روز بعد نماز عشا میٹنگ ہوئی، اور جمعیۃ علماء ہند کا انعقاد عمل میں آیا۔ احتیاط اس قدر مدنظر تھی کہ کسی صاحب نے اثنائے گفتگو میں انگریزوں کے خلاف کوئی بات کہی تو مولانا ثناء اللہ نے فرمایا، بھئی ذرا آہستہ کہئے؛ دیوار ہم گوش دارد۔ حضرت مفتیٔ اعظم جمعیۃ کے صدر اور مولانا احمد سعید صاحب ناظم بنائے گئے۔ اور اس کا سب سے پہلا دفتر مدرسہ امینیہ کے ایک کمرے

میں قائم ہوا۔ (مزید کیفیت رسالہ حالات انعقاد جمعیۃ علمائے ہند میں ملاحظہ فرمایئے۔

صدارت کے لئے ہندوستان کے تمام علماء کا حضرت مفتیٔ اعظم کی ذات والا صفات پر متفق ہو جانا اور مسلسل بیس برس تک متفق رہنا اس کی کھلی دلیل ہے کہ آپ ہی کا کردار اپنے تمام معاصرین (بلکہ اکابرین بھی) اعتدال اور مقبولت کا درجہ رکھتا تھا۔ اور یہ خصوصیت و جامعیت عظمت و کرامت حضرت شاہ ولی اللہ رح کے بعد آپ ہی کو حاصل ہوئی تھی آپ کی رہنمائی میں جمعیۃ علمائے ہند نے ملکی سیاست میں جو اہم کردار پیش کیا، یہاں اس کی تفصیلات کی گنجائش نہیں۔

نجی زندگی و خانہ داری

آپ کی پہلی شادی اس وقت ہوئی تھی، جب کہ آپ مدرسہ عین العلم میں مدرس تھے۔ زوجۂ اول سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی، مگر یہ دونوں بچے خوردسال فوت ہوئے۔ اور کچھ دنوں کے بعد زوجۂ محترمہ کا بھی انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد دوسری شادی ہوئی، اور ان سے سات اولادیں ہوئیں جن میں سے ہم دو بھائی اور دو بہنیں بقید حیات ہیں۔ دہلی میں جب آپ نے اپنی زوجۂ محترمہ کو لانے کا ارادہ کیا تو بارہ دری شیر افگن خاں میں کرایہ پہ مکان لیا، اس کے بعد حویلی اعظم خاں میں متعدد مکان تبدیل کیے۔ کرایہ کے مکانوں میں سب سے آخری مکان کوچہ فولاد خاں گلی مدرسہ شاہ عبدالعزیزؒ میں لیا تھا۔ اس میں آپ ۱۳۳۱ھ سے ۱۳۴۳ھ تک رہے۔ اسی دوران میں کوچۂ چیلان میں ایک مکان خرید لیا تھا۔ ۱۳۴۳ھ میں کچھ تعمیری تغیر و تبدل کرکے ذاتی مکان میں منتقل ہوگئے۔ وفات کے وقت آپ نے دو مکان

چھوڑے تھے۔ جن میں سے ایک مکان کو کسٹوڈین صاحب نے نیلام کر دیا ہے۔

متفرق حالات و خدمات

مؤتمر حجاز جب حجاز سے شریف حسین کی عملداری کو سلطان ابن سعود نے ختم کر دیا تو دنیائے اسلام کا ایک نمائندہ اجتماع منعقد کرنے کی تجویز ہوئی۔ یہ مؤتمر عالم اسلامی مورخہ ۲۶، ذیقعدہ ۱۳۴۴ھ کو مکہ معظمہ میں شریف شرف عدنان کی صدارت میں منعقد ہوئی، اور اس میں تمام ممالک اسلامیہ کے منتخب وفود شریک ہوئے تھے۔ جمعیۃ علمائے ہند کی طرف سے بھی آپ کی صدارت میں وفد بھیجا گیا۔ آپ نے سلطان ابن سعود سے مطالبہ کیا کہ مؤتمر میں حجاز کے لئے حکومت کی تشکیل کا مسئلہ بھی زیر بحث آنا چاہیے۔ چنانچہ یہ مسئلہ ایجنڈے میں شامل کر لیا گیا۔ سبجکٹ کمیٹی کے لئے جو ارکان منتخب کیے گئے ان میں مفتیٔ اعظم فلسطین کے بعد آپ ہی کا نام تھا۔ مؤتمر میں آپ نے بہت سی تجاویز پیش کیں اور کارروائی میں بہت زیادہ نمایاں حصہ لیا۔

ایک ملاقات میں سلطان ابن سعود سے آپ نے کہا کہ اگر آپ کو مدینہ منورہ میں بھی وہی کرنا تھا جو مکہ معظمہ میں ہوا، تو دنیائے اسلام سے وعدہ کیوں کیا تھا کہ ہم مؤتمر اسلامی کے فیصلے تک مدینہ منورہ میں کوئی قابل شکایت کام نہیں کریں گے۔ سلطان نے کچھ تامل کے بعد

جواب دیا کہ میری قوم کے پانچ ہزار آدمیوں نے مجھے دھمکی دی کہ اگر میں مقابر و مآثر کو منہدم نہ کروں گا تو وہ خود چڑھائی کر کے یہ کام کریں گے مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ مبادا وہ مجھ سے بھی زیادہ تخریب کریں۔ اس لئے میں نے ان کا مطالبہ پورا کیا۔ آپ نے جواب میں کہا کہ کیا آپ کو اپنی قوم کا حال معلوم نہ تھا؟ جب آپ ان کی وحشت و بربریت کو جانتے تھے، اور اعلانِ ملوکیت کے وقت تجربہ بھی کر لیا تھا تو آپ نے اس قسم کا وعدہ کیوں فرمایا؟ سلطان توسٹ پٹا کر لاجواب ہو گئے، ایک مصاحب نے کہا جلالۃ الملک نے یہ سوچا تھا کہ میں اپنی قوم کو سمجھالوں گا۔ آپ نے فرمایا کس طریقے پر سمجھا لینے کی امید تھی؟ دلیل و محبت سے؟ یا قوت سے؟ اس پر تمام حاضرین لاجواب ہو گئے۔

مؤتمر فلسطین جب برطانیہ نے فلسطین کو تقسیم کیا اور ایک حصے میں یہودیوں کی حکومت قائم کر دی تو فلسطین کے عربوں میں سخت ہیجان و اضطراب برپا ہوا۔ اس سلسلے میں جمعیۃ علمائے ہند نے بھی مجلس تحفظ فلسطین قائم کی تھی۔ شہدائے فلسطین کے لئے چندہ جمع کیا اور ۲۶ اگست ۱۹۳۸ء کو تمام ہندوستان میں تقسیم فلسطین کے خلاف مظاہرہ کیا گیا۔ اس کے بعد برطانیہ نے قاہرہ میں عالم اسلامی کے نمائندوں کی ایک کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز کی، یہ کانفرنس "مؤتمر البرلمانیۃ المصریۃ للدفاع عن فلسطین" کے نام سے مشہور ہے۔ مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو یہ مؤتمر قاہرہ میں علی علوبہ پاشا کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ جمعیۃ علمائے ہند کی طرف سے اس کی شرکت کے لئے حضرت مفتیٔ اعظم کی صدارت میں وفد بھیجا گیا تھا۔ قابل ذکر امر یہ ہے کہ اس میں تمام عالم اسلامی کے تقریباً

ساڑھے تین ہزار منتخب نمائندے شریک تھے۔ اور صدر کے دائیں جانب مفتیٔ اعظم ہند کی کرسی رکھی گئی تھی۔ اور اس کی سبجکٹ کمیٹی میں بھی آپ کا نام رکھا گیا تھا۔ آپ نے اپنے بیان میں فرمایا تھا کہ "اگر خدا نخواستہ فلسطین کے عرب تقسیم فلسطین پر راضی ہو بھی جائیں، تب بھی ہم ہندوستانی کبھی اس پر راضی نہ ہوں گے، اور اپنی جدوجہد برابر جاری رکھیں گے۔" آپ کی علالت کی وجہ سے آپ کا تحریری بیان مولانا عبدالحق صاحب مدنی نے پڑھا تھا۔

آزادیٔ ہند کی تحریک

ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں آپ دو مرتبہ گرفتار ہوئے، پہلی مرتبہ سنہ ۱۹۳۰ء کی تحریکِ سول نافرمانی میں قانون تحفظ امن عامہ اور بغاوت کے جرم میں ۱۱ اکتوبر سنہ ۱۹۳۰ء مطابق ۱۷ رجادی الاولیٰ سنہ ۱۳۴۹ھ کو اپنے دولت خانہ واقع کوچہ چیلاں سے صبح کے چار بجے گرفتار کیے گئے، اور ڈسٹرکٹ جیل گجرات میں بھیج دیئے گئے۔ ۶ ماہ قید بامشقت اور اے کلاس دی گئی۔

دوسری گول میز کانفرنس دسمبر سنہ ۱۹۳۱ء کی ناکامی کے بعد دوبارہ سول نافرمانی کی تحریک جاری ہوئی، اس موقع پر آپ کو جمعیۃ علمائے ہند کا پہلا ڈکٹیٹر بنایا گیا تھا۔ دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی میں آپ کو آزاد پارک (عقب ٹاؤن ہال) کے جلسے میں گرفتار کیا گیا۔ ۱۸ ماہ قید بامشقت اے کلاس کا حکم سنا کر نیو سنٹرل جیل ملتان بھیج دیا گیا تھا۔

دمِ واپسیں

۲۶ شوال سنہ ۱۳۵ھ کو آپ نے مدرسہ امینیہ کے انتظام کے بارے میں جو ہدایات شائع کی تھیں، اس کی تمہید مندرجہ ذیل ہے:۔

"چونکہ مذہب کی آزادی وطن کی آزادی کے ساتھ وابستہ ہے اور اس کے لئے جدوجہد کرنا میں اپنا مذہبی فرض سمجھتا ہوں اور اس فریضے کی ادائیگی کے جرم میں مجھے توقع ہے کہ میں گرفتار کرلیا جاؤنگا۔ اس لئے مدرسہ امینیہ دہلی کی ان ذمہ داریوں کو جو میرے اوپر ہیں پیش نظر رکھ کر میں نے حسب ذیل انتظام کر دیا ہے تاکہ میری اسیری کے زمانہ میں مدرسہ کے کام میں کوئی خلل نہ آئے، اور حقیقی نگران و محافظ تو رب العزت جل شانہٗ ہی ہے۔"

یہ مجاہدین ملت اور شہیدان وطن کا خواب تھا۔ افسوس کہ آزادی وطن کے بعد بھی اس کی تعبیر پوری نہ ہوئی۔ اپنی زندگی میں انھوں نے حصول مقصد کے لئے بڑی بڑی کٹھن منزلیں طے کیں، بڑی بڑی آفتیں جھیلیں۔ لیکن اس کارگاہ کون و فساد سے کوچ کرنے سے پہلے خود اپنی آنکھوں سے اپنی آرزوؤں کا خون ہوتے ہوئے بھی دیکھ گئے۔ ان کے کیا تاثرات اور کیا احساسات تھے۔ اب الفاظ میں کون ان کو بیان کر سکتا ہے۔ یہ جگر کا ناسور وہ اپنے ساتھ لے گئے۔ زندگی میں اس کو بھٹتے ہوئے کسی نے نہ دیکھا۔

آپ تقریباً ۱۰ برس سے گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ جلسوں اور پبلک کاموں میں کوئی حصہ نہ لیتے تھے۔ الہ آباد کے ہندی اخبار "امرت پتریکا" نے جب رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی اور اس کے خلاف احتجاج کے طور پر ۱۴ اگست ۱۹۵۲ء کو جامع مسجد شاہجہانی کے سامنے جمعیۃ علماء کے اہتمام سے بہت بڑا عظیم الشان جلسہ ہوا۔

اس کی صدارت آپ نے ہی فرمائی تھی۔ یہ دس برس کی گوشہ نشینی کے بعد پہلی اور آخری صدارت تھی۔ اسی وقت سے آپ کی صحت گرنے لگی آپ ہر وقت اداس اور ملول رہنے لگے۔ ایک روز آبدیدہ ہوکر فرمایا کہ ہم کو بھی اپنی زندگی میں کیا کیا دیکھنا تھا۔

ہوگیا مخمور اس آغاز کا انجام بھی ۔۔۔ میں نے غم کھا تو لیا لیکن مجھے غم کھا گیا

آہ! لبوں پر مہر خاموشی تھی، دل سلگ رہا تھا۔ عاشقان جاں باز کے دل پر کیا گذرتی ہے اس کو وہی سمجھ سکتا ہے جس کو کبھی عشق سے واسطہ پڑا ہو۔ کسی کو کیا خبر تھی کہ ملت اسلامیہ کے اس بوڑھے سپہ سالار کے دل پر کیا گذر رہی ہے۔ آدھی صدی دینی و سیاسی جد و جہد میں گزار کر بوڑھا شہسوار زمانے کی ناسازگاری سے تھک چکا تھا۔ اب اس کو ایک نیند کی ضرورت تھی۔ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن رحمت کا ایک جھونکا آیا اور اس کو نیند آگئی۔

یہ ۸۰ برس کی بے داغ زندگی کیا تھی، ایک شاعر کی نظر میں۔

زیست ہے ایک وقفۂ موہوم ۔۔۔ زندگانی سے زندگانی تک

لیکن یہ وقفۂ موہوم ایک انقلاب انگیز برق تھی، ایک اسوۂ حسنہ تھا۔ حریم نبوت کی روشنی اور چمنستان شریعت کی نسیم تھی جو ۱۲ ہم ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ ۳۱ دسمبر ۱۹۵۲ء یکم جنوری ۱۹۵۳ء کی درمیانی شب یعنی پنجشنبہ کو ½ ۱۰ بجے ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(آپ کا مزار مہرولی میں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے احاطے کے باہر ظفر محل کے متصل واقع ہے۔

اخلاق و عادات اور کچھ متفرق حکایات

آپ نہایت سادہ طبیعت خاموشی پسند تھے۔ وقار اور متانت کا یہ عالم تھا کہ چھوٹے آپ کے رعب سے کانپتے اور احباب و رفقاء آپ کی ہیبت سے ڈرتے تھے۔ خوش اخلاق اور مرنجاں مرنج تھے۔ اپنا کام خود کرنے کے عادی تھے۔ ہنر مند ایسے تھے کہ کوئی کام آپ کے لئے مشکل نہ تھا۔ خط نہایت عمدہ اور دلفریب تھا۔ آپ کا کمال خوشنویسی بالکل وہبی اور محض عطیہ ربانی تھا۔ خوشنویسی کی مشق آپ نے کبھی نہیں کی۔

حساب میں بڑی عمدہ مہارت تھی۔ سادہ لباس پہنتے تھے۔ کوئی امتیازی شان پیدا کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ شہرت و نمائش سے ہمیشہ متنفر رہے۔ عربی اور فارسی میں بہت عمدہ شعر کہتے تھے، اردو میں بھی کچھ تھوڑی سی شاعری کی ہے۔ عربی ادب اور عربی مکالمے میں فصاحت و بلاغت کا یہ عالم تھا کہ عرب کے علماء نے آپ کی زبان دانی کی تعریف کی اور کہا کہ ہندوستان کے علماء میں ہم نے صرف آپ کو اہلِ زبان کیطرح شستہ زبان بولتے ہوئے سنا۔

شیخ الازہر علامہ مصطفیٰ المراغی مرحوم نے آپ کے متعلق فرمایا تھا کہ ینبلج العلم والوقار فی جبینہ (اس شخص کی پیشانی پر علم اور وقار چمکتا ہے)

عالم اسلام کے اکثر زعماء سے آپ کے تعلقات اور خط وکتابت تھی۔
مفتئ اعظم فلسطین آپ کا بڑا احترام کرتے تھے۔ سید توفیق شریف مرحوم (شامی لیڈر) جب ہندوستان آتے تھے تو اکثر آپ کے دولت خانہ پر قیام کرتے تھے۔ ہندوستان کے لیڈر تو آپ کو اپنا بزرگ تسلیم کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مولانا محمد علی وغیرہ کی دعوت کی۔ دسترخوان پر چنے کی دال کا بھرتہ بھی تھا۔ حکیم صاحب نے اسکو بہت پسند کیا اور فرمایا کہ مفتی صاحب یہ دال ضرورت سے زیادہ لذیذ کیوں ہے؟ فرمایا کہ یہ میں نے اپنے ہاتھ سے پکائی ہے اور چونکہ خلوص کے ساتھ پکائی ہے۔ اس لئے لذیذ معلوم ہو رہی ہے۔

آہ! اب نہ وہ خلوص والے رہے، نہ وہ خلوص کی قدر پہچاننے والے رہے۔ حکیم صاحب مرحوم اپنی مجلس اور مطب میں کسی والئ ریاست کے استقبال کے لئے بھی کھڑے نہ ہوتے تھے۔ لیکن جب آپ تشریف لاتے تھے تو سروقد کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور دوڑ کر دروازے سے آپ کو اپنے ساتھ لاتے تھے۔

حضرت مولانا محمد انور شاہ نور اللہ مرقدہٗ فرمایا کرتے تھے کہ مفتی کفایت اللہ کا وجود اسلام کی حقانیت کی دلیل ہے۔ آپ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ سے بیعت تھے۔ مگر خود کسی کو بیعت نہیں کیا جب کوئی عقیدتمند بیعت کی درخواست کرتا تھا تو مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ یا مولانا عبد القادر رائے پوری مدظلہم العالی یا مولانا حسین احمد مدنیؒ یا مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہونے کی ہدایت فرماتے تھے
ایک مرتبہ راقم الحروف کچھ بیمار ہو گیا، اس وقت چھ، سات برس

کی عمر تھی۔ والد مرحوم نے اپنے ایک شاگرد مولوی محمد ایوب کولعل پوری کیساتھ مجھے ڈاکٹر انصاری کے مطب میں بھیجا۔ اس زمانہ میں ڈاکٹر صاحب کا مطب مسجد فتحپوری کے شرقی دروازے کے دائیں جانب کمرے پر (بالمقابل کورونیشن ہوٹل) واقع تھا۔ مطب کے منیجر غالب صاحب تھے (جو رشتے میں غالباً ڈاکٹر صاحب کے خالہ زاد بھائی تھے) تمام آنے والے مریضوں کے نام رجسٹر پر لکھتے تھے۔ فیس وصول کرتے تھے اور مطب میں ترتیب وار بھیجتے تھے، اس زمانہ میں ڈاکٹر صاحب کے معائنہ کی فیس پانچ روپے تھی، والد محترم نے مجھ کو اپنے ساتھ لے جانا اسلئے مناسب نہ سمجھا کہ شاید ڈاکٹر صاحب فیس قبول نہ کریں۔ مولوی محمد ایوب کو سمجھا دیا تھا کہ وہاں میرا نام نہ لینا، جب مطب میں پہونچے فیس پیش کی، تو غالب صاحب نے پوچھا کہ اس بچہ کے والد کا کیا نام ہے۔ مولوی صاحب نے کہا عبداللہ، پھر پوچھا آپ کہاں سے آئے ہیں۔ انھوں نے کہا یہیں دہلی شہر سے۔ غالب صاحب کی یہ کیفیت تھی کہ نوٹ ہاتھ میں تھا اور الٹ پھیر کر مختلف سوالات کر رہے تھے۔ دیگر حاضرین بھی حیران تھے کہ اس قدر تحقیقات کیوں ہو رہی ہے۔ آخر جب کچھ نہ کھلا تو نوٹ کو میز کی دراز میں رکھ لیا، اور اندر ڈاکٹر صاحب کے پاس چلے گئے۔ دو تین منٹ کے بعد واپس آئے۔ اور ہم کو نمبر کے خلاف اندر بھیج دیا۔ ہم معائنہ کے کمرے میں داخل ہوئے تو ڈاکٹر صاحب کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر آیا۔ جب انکی متجسس اور متبسم نگاہیں مجھ پر پڑیں تو کچھ ایسا محسوس ہوا کہ سورج کی شعاع میرے دل کو برما رہی ہے۔ میرے سلام کے جواب کے بعد میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انھوں نے پہلا سوال یہ کیا، کہو بیٹا تمھارے ابا کا کیا نام ہے؟ میں نے کہا اباجی۔ بے ساختہ ہنس پڑے اور مولوی ایوب سے کہا کہ مولوی صاحب سچ کہئے! کیا یہ مولانا

روپے لیتا ہوں، مگر آپ سے دس روپے لونگا۔ آپ کے پاس اس وقت صرف دس روپے تھے۔ دکاندار کو کچھ نہیں دیا۔ گھر آکر اپنے ایک خادم کو پندرہ روپے دیئے، اور فرمایا کہ اگر وہ پورے پندرہ روپے نہ لے تو اس کے سامنے پھینک کر آجانا۔

مکان کے لئے زمین خرید لی تھی، مگر بنوانے کے لئے روپیہ نہ تھا۔ دہلی کے ایک رئیس نے آپ سے درخواست کی کہ میں روپیہ پیش کر دوں گا، آپ تعمیر شروع کرا دیجئے۔ آپ نے انکار فرما دیا۔ کچھ دنوں کے بعد پھر انھوں نے اصرار کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اچھا کچھ روپیہ قرض دیدو اور پرونوٹ لکھوالو۔ انھوں نے ضابطے کے مطابق پرونوٹ انگریزی میں ٹائپ کرا کر پیش کیا۔ فرمایا کہ اس کا ترجمہ مجھے سناؤ۔ انھوں نے ترجمہ سنایا، آپ نے دستخط کرنے سے انکار فرما دیا۔ کیونکہ اس میں شرح سود بھی لکھی ہوئی تھی۔ انھوں نے بہت کچھ سمجھانے اور تسلی دلانے کی کوشش کی کہ حضرت یہ تو صرف ضابطہ کی خانہ پری ہے، ورنہ ہم نے عمر بھر میں نہ کسی کو سود دیا، نہ کسی سے سود لیا، فرمایا کہ مجھے قرض لینے کی ضرورت نہیں ہے آپ مجھے معاف کیجئے۔ آخر انھوں نے دوسرا پرونوٹ ٹائپ کرایا جب آپ نے دستخط فرمائے۔ قرض سے ہمیشہ بچتے تھے۔ وفات کے وقت آپ کسی کے مقروض نہیں تھے۔

آپ کے ہزاروں شاگرد ہندوستان، پاکستان، برما، ملایا، جاوا، سماٹرا عراق، حجاز، شام، افغانستان، ایران، بخارا، ختن، تبت، چین اور افریقہ تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کے مشاہیر میں سے حضرت مولانا حافظ اعزاز علی (استاذ الفقہ والادب دار العلوم دیوبند) حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن (صدر مفتی دار العلوم دیوبند) اور حضرت مولانا حافظ احمد سعید

(ناظم اول جمعیۃ علمائے ہند) آپ کے محبوب اور خاص شاگردوں میں سے ہیں۔

آپ کے کمالات وفضائل کی شرح وتفصیل مجھ جیسے ہیچمداں کے امکان سے باہر ہے۔ اپنی کوتاہ علمی نیز قلت گنجائش کی وجہ سے مقالۂ ہذا کو ختم کرتا ہوں۔ ابھی آپ کے کمالات وفضائل اور آپ کی علمی و دینی خدمات پر بہت کچھ لکھا جائیگا موجودہ نسل کو بھی آپ بہت کچھ سکھا گئے۔ اور آئندہ نسلیں بھی آپ کے اسوہ سے بہت کچھ سیکھیں گی۔ چودھویں صدی ہجری کا یہ عظیم المرتبت انسان تھا جو انبیاء علیہم السلام کی سادگی واستغناء، خودداری وتحمل، دیانت وامانت، صبر وقناعت اور عزم واستقلال کا نمونہ پیش کرگیا۔

اللّٰھم اغفر لہ ومتعنا باسوتہ انک ارحم الراحمین۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا آپ کی عظیم الشان زندگی کے چند پہلوؤں پر ہلکی سی روشنی ڈالنے کی مختصر کوشش تھی، پھر بھی مضمون کافی طویل ہوگیا ہے، اسلئے اب آپ کے چند ممتاز شاگردوں کا مختصر تذکرہ (اپنے وعدے کے مطابق) عرض کرتا ہوں۔

آپ کے چند شاگرد

مولوی محمد حسین راندیری:۔ راندیر میں جامعہ حسینیہ آپ ہی کا قائم کیا ہوا ہے۔ یہ مدرسہ صوبہ گجرات کا مشہور اور نیک نام دینی مدرسہ ہے آپکے انتقال کے بعد مدرسے کا انتظام آپ کے بڑے بھائی مولوی حکیم محمد ابراہیم نے سنبھالا آپ بڑے جید عالم اور متقی وپاکباز بزرگ تھے۔

مولوی حکیم محمد ابراہیم صاحب راندیری:۔ آپ مولوی محمد حسین بانی مدرسہ حسینیہ کے بڑے بھائی تھے۔ ان دونوں بھائیوں کی وجہ سے گجرات کے علاقہ

میں علوم اسلامیہ کو بہت فروغ ہوا۔ عمر بھر دین متین کی اور حدیث نبوی کی خدمت میں مشغول رہے۔ ۱۳۷۲ھ میں آپ کا انتقال ہو گیا، اب آپکے فرزند مولوی محمد سعید صاحب مدرسہ حسینیہ کے مہتمم ہیں۔

مولوی حافظ محمد یٰسین صاحب سکندر آبادی رائپوری:۔ آپ اصل میں سکندر آباد ضلع بلند شہر کے باشندے تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد کچھ دنوں مدرسے ہی میں پڑھاتے رہے، پھر آپ کو حضرت مفتیٔ اعظم نے رائے پور بھیج دیا۔ وہاں آپ نے مدرسہ اسلامیہ قائم کیا جو صوبۂ متوسط کا کامیاب دینی مدرسہ ہے۔ آپ نہایت جید عالم اور خوش الحان قاری تھے حضرت مولانا احمد سعید صاحب کے اولین اساتذہ میں سے تھے، عادات وخصائل اور اخلاق میں اپنے شیخ حضرت مفتیٔ اعظم نوراللہ مرقدہ سے بہت مشابہ تھے۔ جمعیۃ علمائے صوبۂ متوسط کے صدر بھی تھے۔ ۱۳۷۲ھ میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ مدرسے کا انتظام آپ کے شاگردوں کے ہاتھ میں ہے۔

مولوی عبدالعزیز صاحب جیندوی:۔ ریاست جیند (مشرقی پنجاب) میں آپ نے درسگاہِ عزیزیہ کے نام سے دینی مدرسہ قائم کیا تھا جس کے سرپرست مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند تھے، مشرقی پنجاب میں آپ کی وجہ سے اور آپ کی درسگاہ کی بدولت ہزارہا مسلمانوں کو فیض پہنچا، اور جو لوگ صرف نام کے مسلمان تھے، آپ کے فیض و توجہ سے سچے باعمل مسلمان بن گئے۔ آپ کے انتقال کے بعد آپ کے صاحبزادے مولوی عبدالحلیم قمر نے (جو مدرسہ امینیہ کے تعلیم یافتہ تھے) درسگاہِ عزیزیہ کا انتظام سنبھالا تھا۔ افسوس کہ ۱۹۴۷ء کے خونین انقلاب میں آپ کا سارا خاندان شہید ہو گیا۔

مولوی سید داؤد علی نصیر آبادی :- اجمیر کے علاقہ میں آپ کے وعظ و نصائح سے بہت فیض پہنچ رہا ہے۔ آپ اس علاقہ کی جمعیۃ علماء کے صدر بھی ہیں۔

حضرت مولانا مفتی عبد الصمد صاحب مکرانی :- آپ ۱۳۵۴ھ میں مدرسہ امینیہ سے فارغ التحصیل ہوئے، اور اپنے وطن میں درس و تعلیم میں مشغول رہے۔ آج کل آپ ریاست قلات کے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) ہیں۔ عربی ادب میں بھی خوب مہارت رکھتے ہیں۔ عربی میں شعر بھی کہتے ہیں۔ مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی تحریک سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔

مولانا احمد مسلم افریقی :- آپ افریقہ کے مشاہیر علماء میں سے ہیں۔ افریقہ میں آپ کی وجہ سے رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری ہے۔ مدرسہ امینیہ کے لئے آپ اپنے زیر اثر حلقوں سے بہت امداد و اعانت فرماتے ہیں۔ افسوس کہ ۱۳۸۶ھ میں آپ کا انتقال ہوگیا۔

مولانا محمد تقی صاحب بارہ بنکی :- آپ ۱۳۶۹ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔ نہایت ذکی، ذہین اور قابل ترین عالم ہیں۔ آپ اجمیر میں درس و تدریس میں مشغول رہے۔ پھر ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ایک معزز عہدے پر فائز رہے۔ "اسلام کا زرعی نظام" وغیرہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ اب اس وقت آپ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک بڑے عہدے پر فائز ہیں۔

مولوی سید محمد فاروق صاحب دہلوی :- آپ ۱۳۵۷ھ ہجری میں فارغ التحصیل ہوئے۔ کچھ عرصے تک حضرت مفتی اعظم کی خدمت میں رہ کر افتاء کی خدمت انجام دیتے رہے، آجکل آپ دہلی کی مشہور تربیت گاہ "بچوں کا گھر" کے نگران و مہتمم ہیں۔

مولانا مولوی عبدالسبحان صاحب میواتی:۔ آپ مدرسہ سبحانیہ کے بانی و مہتمم ہیں۔ پہلے یہ مدرسہ قرول باغ میں تھا، آج کل قصاب پورہ میں ہے۔ ابتدائی دینی تعلیم اس میں خاص طور پر عمدہ ہوتی ہے۔ آپ کے چار صاحبزادے مولوی عبدالمنان، مولوی عبدالرحمٰن، مولوی عبدالحنان، مولوی عبدالغفار ذی استعداد عالم حافظ اور قاری ہیں۔ یہ چاروں صاحبزادے بھی حضرت مفتیٔ اعظم کے شاگرد ہیں۔

مولوی محمد فاروق صاحب واصفی:۔ دہلی کے مشہور خوش بیان واعظ اور شاعر ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

مولوی مفتی محمد شفیع صاحب ملتانی:۔ ملتان میں علوم نبویہ کی تعلیم و اشاعت میں مشغول ہیں۔ افتار کی خدمت بھی انجام دیتے ہیں۔ آپ نے ایک مدرسہ قاسم العلوم کے نام سے قائم کیا ہے۔ جس کے مہتمم بھی آپ خود ہی ہیں۔ بے انتہا شریف الطبع اور اسلامی تہذیب و اخلاق کا نمونہ ہیں۔ اپنے استاد حضرت مفتیٔ اعظم کے مخلص خادم اور سچے عاشق ہیں، آپکا مدرسہ ملتان میں سب سے عمدہ معیار کا مدرسہ ہے۔ جب حضرت مفتیٔ اعظم ملتان کے نیو سنٹرل جیل میں اسیر فرنگ تھے اور حضرت کے احباب و عقیدت مند جو ملاقات کے لئے جایا کرتے تھے، ان میں سے اکثر مولانا موصوف ہی کے مکان پر قیام کرتے تھے۔ اور آپ فراخدلی کے ساتھ مہمان نوازی کرتے تھے۔

استاذ محترم حافظ مولوی خدا بخش صاحب پنجابی دہلوی:۔

آپ کی جائے پیدائش مقام للہ شریف ضلع جہلم ہے، اور اب سکونت مقام بھیرہ ضلع سرگودھا ہے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد طویل مدت تک

مدرسہ امینیہ میں ہی مدرس رہے۔ اور حدیث، تفسیر، فقہ اور دیگر علوم کا درس دیتے رہے۔ اب پاکستان میں ایک مدرسے میں شیخ الحدیث و مہتمم ہیں۔ بڑی ٹھوس قابلیت کے مالک ہیں۔ اور تمام علوم و فنون میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ اعلیٰ درجے کے مقرر اور مشہور مناظر ہیں، دہلی میں آپ انجمن سیف الاسلام کے اور مدرسہ امینیہ کی انجمن اصلاح الکلام کے صدر تھے۔ (انجمن اصلاح الکلام ۱۳۲۵ھ میں حضرت مفتی اعظم نے قائم کی تھی) آپ راقم الحروف کے شفیق ترین استاد ہیں۔

مولوی مفتی محمد صالح رنگونی: آپ نے رنگون میں دار التبلیغ کے نام سے ایک اسلامی ادارہ قائم کیا ہے۔ برمی زبان میں اسلامی لٹریچر کے ترجمے شائع کر رہے ہیں۔ آپ خطیب اور مفتی بھی ہیں۔ برما میں آپ کی وجہ سے علوم اسلامیہ واحکام شرعیہ کی کافی نشر و اشاعت ہو رہی ہے۔

مولوی مفتی محمد بن حافظ صالح راندیری: آپ جامع مسجد رنگون کے خطیب اور مفتی ہیں۔ علم افتاء میں خاص طور پر حضرت مفتی اعظم سے فیض حاصل کیا ہے۔ آپ کی علمی قابلیت برما میں ممتاز درجہ رکھتی ہے۔

مولوی مفتی اسمٰعیل محمد بسم اللہ صاحب ڈابھیلی: آپ علاقہ گجرات کے مشہور مفتی اور مرجع علائق عالم ہیں۔ اہل علم اور علم دوست ہیں۔ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل جس میں مولانا محمد انور شاہ اور آپ کے رفقاء نے تعلیمی خدمات انجام دی ہیں۔ آپ اس کے کافی عرصہ تک مہتمم رہے، اور اس کے صدر مفتی ہیں۔ دو تین سال ہوئے آپ وفات پا چکے ہیں۔

حضرت مولانا محمد حسن صاحب دوحدی: آپ دوحد علاقہ گجرات کے باشندے ہیں۔ مقام دوحد مغل شہنشاہ حضرت اورنگ زیب محی الدین عالمگیر کا

جائے پیدائش ہے۔

مولانا موصوف نے بچپن سے بغرض تعلیم وطن سے نکل کر سونی پت اور دہلی میں تعلیم پائی۔ مدرسہ امینیہ میں کافی عرصے تک مدرس اور حضرت مفتیٔ اعظم رح کے معتمد خاص رہے۔ سنہ ۱۹۲۴ء کے شدھی کے زمانے میں حضرت مفتیٔ اعظم رح آپ کو تبلیغی خدمات کے لئے اکثر ملکانوں کے علاقہ میں بھیجتے رہتے تھے۔

آپ نہایت سادہ مزاج بے تکلف مخلص اور بے لوث درویش صفت بزرگ ہیں۔ ہر وقت خوش رہتے اور خوش رکھتے ہیں، ظرافت بذلہ سنجی، محبت آپ کے خمیر میں داخل ہے۔ درس و تدریس میں بہت پرانا تجربہ رکھتے ہیں۔ کافی عرصے تک جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں تعلیمی خدمات انجام دیں۔ برما میں بھی طویل عرصے تک قیام رہا۔ آپ کے تعلقات کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ اپنی سادگی اور محاسن و اخلاق میں اسلاف کا مکمل نمونہ ہیں۔ علاقہ گجرات اور برما میں آپ طوطیٔ گجرات کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔

راقم الحروف کو مولانا موصوف سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ دہلی اکثر تشریف لاتے رہتے ہیں۔ اور مدرسہ میں قیام فرماتے ہیں۔ سفر و حضر میں درس و تدریس وعظ و نصیحت کا مشغلہ جاری رہتا ہے و آپ بھی وفات پا چکے ہیں ۔!

مولوی حکیم محمد قاسم صاحب سورتی:۔ آپ ہندوستان کے چند حاذق طبیبوں میں سے ہیں۔ آپ کی حذاقت اور مہارتِ فن پورے صوبۂ بمبئی میں شہرۂ آفاق و مسلّم ہے۔ آپ کا مطب کامیاب مطب ہے جس میں

روزانہ ڈیڑھ سو مریض دور دراز سے سفر کرکے حاضر ہوتے ہیں۔ اور شفا یاب ہوتے ہیں۔ جید عالم، علم پرور، منکسر المزاج بااخلاق انسان ہیں۔ خاص طور پر اپنے اساتذہ کے ساتھ حسن سلوک اور خدمت کا جذبہ رکھتے ہیں۔ آجکل آپ اپنی علالت اور ضعف کی وجہ سے گوشہ نشین ہوچکے ہیں۔ (دو تین ماہ ہوئے آپ وفات پاچکے ہیں۔)

مولوی حافظ عبدالرحیم صاحب صادق راندیری صدر جمعیۃ علماء صوبہ گجرات

علاقہ گجرات میں آپ کی وجہ سے اسلامی تعلیمات کو بہت ترقی اور فروغ حاصل ہوا ہے۔ آپ بہت عرصے سے اسلامی لٹریچر کو گجراتی زبان میں منتقل کررہے ہیں۔ اور شائع کررہے ہیں۔ آپ نے گجراتی زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ بھی کیا ہے، جو شائع ہوچکا ہے۔ افسوس کہ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۸ھ میں آپ کی وفات ہوگئی۔

شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا حافظ محمد اعزاز علی صاحب

آپ نے حضرت مفتی اعظم رح سے مدرسہ عین العلم شاہجہانپور میں ابتدائی کتابیں پڑھی ہیں۔ بعد ازاں حضرت نے آپ کو تحصیل علم کے لئے دارالعلوم دیوبند بھیجدیا تھا حضرت شیخ الہند سے آپ نے حدیث پڑھی۔ آپ کافی عرصہ تک دارالافتاء دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی بھی رہے ہیں۔ اور آخر تک ناظم تعلیمات اور حدیث وفقہ کے استاد رہے۔ آپ کے تبحر علمی، فضل وکمال اور اخلاق وعادات کے بارے میں کچھ لکھنے کی جرأت کرتا ہوں مگر سوچتا ہوں تو آپ کی شان کے لائق الفاظ نہیں ملتے۔ مختصر یہ کہ دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ میں حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہٗ کے بعد آپ کا درجہ مسلّم تھا۔ آپ کی سوانح حیات تذکرۃ الاعزاز کے نام سے شائع ہوچکی ہے۔ حضرت مفتی اعظم رح کی وفات پر

آپ کو بہت صدمہ ہوا تھا۔ آپ کے تاثرات اس مقالہ سے ظاہر ہوتے ہیں جو الجمعیۃ اخبار کے مفتیٔ اعظم نمبر میں شائع ہوا تھا، اس میں ایک مقام پر آپ تحریر فرماتے ہیں ۔

" مجمع میں تو بے شک مولانا اعزاز علی یا مولانا کہہ کر خطاب کرتے تھے مگر تنہائی میں اعزاز علی یا زیادہ سے زیادہ مولوی اعزاز علی فرمایا کرتے تھے ۔ میرے لئے اب کوئی ایسا نہ رہا کہ شفقت آمیز لہجے میں اعزاز علی یا مولوی اعزاز علی کہے ۔

ہائے استاد ہمارا نہ رہا ۔۔۔ ہم غریبوں کا سہارا نہ رہا "

مورخہ ۱۲ ر رجب ۱۳۷۴ھ کو آپ کا انتقال ہو چکا ہے ۔

ہائے شاگرد بھی استاد کی خدمت میں گیا ۔۔۔ مونھ سے کہتا ہوا لبیک وہ جنت میں گیا
بسکہ آزار سے فرقت کے ہوا تھا رنجور ۔۔۔ استراحت کیلئے حجلۂ راحت میں گیا

مجھ سے کیوں روٹھ گئے میرا مقدر ہو کر ۔۔۔ یہ ستم مجھ پہ ہوا لطف کا خوگر ہو کر
کس نے اعزاز علی کہہ کے پکارا تم کو ۔۔۔ سوئے فردوس روانہ ہوئے مضطر ہو کر

اٹھ گئے تم بھی تو اب صبر کا یارا نہ رہا ۔۔۔ آہ دنیا میں تو اب کوئی ہمارا نہ رہا
بعد مرحوم کے اب ایک سہارا تم تھے ، ۔۔۔ ہم غریبوں کے لئے وہ بھی سہارا نہ رہا

(واصف)

مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب شاہجہانپوری دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد حضرت مفتیٔ اعظم رحمہ نے آپ کو سورت بھیجدیا تھا، آپ طویل عرصے تک

وہاں احکام الٰہی کی ترویج و اشاعت فرماتے اور افتاء کی خدمت انجام دیتے رہے۔ تفقہ فی الدین میں حضرت مفتئ اعظمؒ کے بعد آپ کا درجہ مسلّم ہے۔ آج کل دارالافتاء دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی ہیں۔ آپ کا دسترخوان بھی حضرت شیخ الاسلام کے دسترخوان کی طرح وسیع ہے۔ زاہد و متقی اور صاف گو اور اظہارِ حق میں بیباک ہیں۔ آپ کے دو صاحبزادے مولانا سید احمد میاں اور مولانا سید محمد میاں ماشاء اللہ ذہین اور قابل علماء میں سے ہیں۔ یہ دونوں صاحبزادے بھی حضرت مفتی اعظمؒ کے شاگرد ہیں۔

سحبان الہند حضرت مولانا حافظ احمد سعید صاحب دہلوی

آپ غیر منقسم ہندوستان کے مشاہیر علماء اور صفِ اول کے رہنماؤں میں سے ہیں۔ حضرت مفتئ اعظمؒ کے بڑے عزیز شاگرد اور ابتدائی رفیقوں میں سے ہیں۔ مطالب قرآن پر آپکو بڑا زبردست عبور حاصل ہے فارغ التحصیل ہونے سے پہلے بھی آپ خوش بیان واعظ اور مقرر تھے۔ اور آج تک وعظ و تقریر و ترجمہ کا شغل جاری ہے۔

آپ کا وطن دہلی (کوچہ ناہر خاں) ہے۔ تاریخ پیدائش ربیع الثانی ۱۳۰۶ھ، والد کا نام حافظ نواب مرزا ہے۔ آپ کے والد زینت المساجد میں امام اور مدرس قرآن تھے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم مولوی عبدالمجید مصطفٰے آبادی سے اور عربی کی ابتدائی تعلیم مولوی قاری محمد یٰسین سکندرآبادی رائے پوری سے حاصل کی۔ پھر ۱۳۲۵ھ میں مدرسہ امینیہ میں داخل ہو کر تعلیم حاصل کی اور فارغ التحصیل ہوئے۔

سیاسی تحریکات میں آپ کو آٹھ مرتبہ قید و بند کی تکالیف برداشت کرنی پڑیں گجرات جیل اور ملتان جیل میں حضرت مفتی اعظمؒ کے ساتھ رہے ہیں جمعیۃ علمائے ہند

کے قیام کے وقت سے لیکر بیس برس تک اس کے ناظم اعلیٰ رہے۔ اور اب اس کے نائب صدر ہیں۔ قومی خدمات میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں اور ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد سے تو زیادہ وقت انھیں مشاغل میں گذرتا ہے۔ قرآن حکیم کا ترجمہ بھی لکھ رہے ہیں جس کے کچھ حصے شائع ہو چکے ہیں (آپ بھی وفات پا چکے ہیں)۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا مفتی محمد عبد الغنی پٹیالوی شاہجہانپوری

آپ کی تاریخ پیدائش ۲۴ ذی الحجہ ۱۳۰۱ھ وطن اصلی ڈسکہ (پٹیالہ) والد کا نام مولوی جمال الدین بن مولوی فتح محمد خاں، آپ کے دادا مولوی فتح محمد خاں عربی میں حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے اور فارسی میں مولانا امام بخش صہبائی دہلوی کے شاگرد تھے، تقریباً ۱۱۵ برس کی عمر میں انتقال فرمایا تھا، اس وقت آپ کی عمر تقریباً بارہ تیرہ برس کی تھی۔

آپ نے ابتدائی کتابیں اپنے دادا سے پڑھیں۔ پھر تقریباً پندرہ برس کی عمر میں دہلی آئے۔ مولوی جمال الدین جو مدرسہ امینیہ میں حدیث پڑھتے تھے ان سے صرف و نحو کی کتابیں پڑھیں۔ پھر ۱۳۲۵ھ میں مدرسہ امینیہ میں داخل ہو کر تعلیم حاصل کی۔ اور ۱۳۳۲ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔ آپ اپنے ہم جماعتوں میں ممتاز ترین ذکی و فہیم طالب علم تھے۔ دوران تعلیم میں ہی معقولات کی کتابیں پڑھاتے تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد ایک سال تک مدرسے میں پڑھایا، پھر حضرت مفتی اعظمؒ نے آپکو مدرسہ عین العلم شاہجہانپور کا صدر مدرس بنا کر بھیجدیا۔

شاہجہانپور کو آپ نے اپنا وطن بنالیا، اور وہیں آپ کی شادی ہوئی، آپکے اہل وعیال بھی وہیں رہتے ہیں۔ آپ کے ایک صاحبزادے مولوی عبد الحی اسلامیہ کالج شاہجہانپور میں پرشین ٹیچر ہیں۔ حضرت مفتی اعظمؒ نے اپنے مرض وفات میں جبکہ مدرسہ کے لئے ایک مدرس کی ضرورت تھی آپ کو بلالینے کا مشورہ دیا تھا۔

چنانچہ مدرسہ عین العلم میں ۳۰ برس حضرت مفتی اعظم کے حکم کے مطابق درس دینے کے بعد آپ یکم ذیقعدہ ۱۳۷۲ھ کو مدرسہ امینیہ دہلی میں تشریف لے آئے، اب آپ ہی شیخ الحدیث و صدر مفتی ہیں (دو تین سال ہوئے آپ مدرسہ سے مستعفی ہو کر شاہجہانپور تشریف لے گئے ضعیفی کی وجہ سے بالکل گوشہ نشیں رہے۔ ۱۳۸۵ھ میں وفات ہو گئی۔)

آپ نہایت خاموش طبع، تنہائی پسند، گوشہ نشین متبع سنت ہیں اور بہت ہی سیدھی سادی طبیعت رکھتے ہیں۔ بہت کم بولتے ہیں۔ لیکن درس میں بڑی مبسوط اور عالمانہ تقریر ہوتی ہے۔ تمام علوم و فنون پر حاوی اور ٹھوس قابلیت کے مالک ہیں۔ تبحر علمی اور جامعیت کمالات میں حضرت مفتی اعظم کے پرتو اور نمونہ ہیں۔

خاتمہ کلام الحمدللہ کہ اللہ کا دین خالص محفوظ ہے اور ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ قال اللہ عزوجل، انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون

اے شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کی دلی کے رہنے والو! تمہاری غفلت اور قدر ناشناسی کے باوجود نہ معلوم اللہ کو تمہاری کونسی ادا پسند ہے کہ یہ دولت تم سے سلب نہیں کی گئی۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین ☩

خادم الطلبہ حفیظ الرحمان واصف

(نوٹ) مقالہ مذکورہ ماہنامہ "البلاغ" بمبئی کے تعلیمی نمبر کے لئے لکھا گیا تھا اور البلاغ تعلیمی نمبر ماہ دسمبر ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد بنظر ثانی اخبار الجمعیۃ دہلی کے سنڈے ایڈیشن میں ۹ جولائی ۱۹۵۶ء سے یکم اکتوبر ۱۹۵۶ء تک شائع ہوتا رہا۔ نظر ثالث کے بعد کتابی صورت میں ہدیہ ناظرین کیا گیا۔ اور اب نظر رابع کے بعد کتابچہ کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا جا رہا ہے۔ حفیظ الرحمان واصف

جمادی الثانی ۱۳۸۹ھ

الدّال على الخير کفاعلہ

دوسروں کو نیکی کی طرف بُلانے والا بھی نیکی کرنیوالے کے برابر ہے

لہذا اپنے عزیزوں اور دوستوں کو بھی
مدرسۂ امینیہ کا معاون بنائیے ۔ یہی چیز
آخرت میں کام آئے گی!